

الرسالہ

Al-Risāla

October 2001 • No. 299 • Rs. 10

سمجھوتہ جب بھی ہوتا ہے لین دین کے اصول پر ہوتا
ہے نہ کہ فریق ثانی سے صدی اپنی بات منوانے پر۔



عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کی قلم سے

60.00	دین انسانیت	5.00	اسلام: ایک عظیم جدوجہد	400.00	تذکیر القرآن (مکمل)
50.00	فکر اسلامی	5.00	تاریخ و دعوت حق	60.00	مطالعہ سیرت
50.00	ششم رسول کا مسئلہ	12.00	مطالعہ سیرت (کتابچہ)	85.00	اسباق تاریخ
5.00	طلاق اسلام میں	80.00	ڈائری (جلد اول)	60.00	تعمیر حیات
60.00	مضامین اسلام	65.00	کتاب زندگی	50.00	تعمیر انسانیت
7.00	حیات طیبہ	25.00	اقوال حکمت	85.00	سفر نامہ (غیر ملکی اسفار، جلد اول)
7.00	باغ جنت	8.00	تعمیر کی طرف	125.00	سفر نامہ غیر ملکی اسفار، جلد دو
7.00	تار جہنم	20.00	تیلغنی تحریک	80.00	اسلام: ایک تعارف
8.00	سچا راستہ	25.00	تجدید دین	60.00	اللہ اکبر
7.00	دینی تعلیم	35.00	عقائیات اسلام	50.00	پنچبر انقلاب
10.00	خلج ڈائری	25.00	قرآن کا مطلوب انسان	65.00	مذہب اور جدید چیلنج
7.00	رہنمائے حیات	7.00	دین کیا ہے؟	35.00	عظمت قرآن
7.00	تعداد ازواج	20.00	اسلام دین فطرت	50.00	عظمت اسلام
60.00	ہندوستانی مسلمان	7.00	تعمیر ملت	7.00	عظمت صحابہ
7.00	روشن مستقبل	7.00	تاریخ کا سبق	80.00	دین کامل
7.00	صوم رمضان	5.00	فسادات کا مسئلہ	45.00	الاسلام
5.00	اسلام کا تعارف	5.00	انسان اپنے آپ کو پہچان	50.00	ظہور اسلام
20.00	علماء اور دور جدید	5.00	تعارف اسلام	40.00	اسلامی زندگی
60.00	سفر نامہ اسپین و فلسطین	5.00	اسلام پندرہویں صدی میں	35.00	احیاء اسلام
12.00	ملکسزم: تمدن جس کو روک رکھی ہے	12.00	راہیں بند نہیں	65.00	راز حیات
10.00	سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	7.00	ایمانی طاقت	40.00	صراطِ مستقیم
5.00	یکساں سول کوڈ	7.00	اتحاد ملت	60.00	خاتون اسلام
8.00	اسلام کیا ہے؟	7.00	سبق آموز واقعات	50.00	سوشلزم اور اسلام
35.00	میوات کا سفر	10.00	زلزلہ قیامت	30.00	اسلام اور عصر حاضر
35.00	قیادت نامہ	12.00	حقیقت کی تلاش	40.00	الربانیہ
5.00	منزل کی طرف	5.00	پنچبر اسلام	45.00	کاروانِ ملت
125.00	اسفار ہند	7.00	آخری سفر	30.00	حقیقت حج
100.00	ڈائری ۹۰-۱۹۸۹	7.00	اسلامی دعوت	35.00	اسلامی تعلیمات
70.00	قال اللہ و قال الرسول	10.00	حل یہاں ہے	25.00	اسلام دور جدید کا خالق
90.00	ڈائری ۹۲-۱۹۹۱	25.00	امہات المؤمنین	40.00	حدیث رسول
80.00	مطالعہ قرآن	85.00	تصویر ملت	25.00	راہ عمل
40.00	مذہب اور سائنس	50.00	دعوت اسلام	80.00	تعمیر کی غلطی
		40.00	دعوت حق	25.00	دین کی سیاسی تعبیر
		80.00	نثری تقریریں	7.00	عظمتِ مومن

الرسالہ اکتوبر 2001

فہرست

- 4 قدرتی ڈھال
5 تدبیر و توکل
7 خدا اور سائنس
11 میرٹھ کا سفر
46 ایک خط



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الرسالہ

Al-Risala

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کاترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel. 435 6668, 435 1128
Fax 435 7333, 435 7980
e-mail: info@goodwordbooks.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES

Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year \$ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY

IPCI: ISLAMIC VISION
434, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137 • Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY

AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
5801 SW 106th Ave,
Cooper City, FL 33328 U.S.A.
Tel. (954) 4348404 • Fax (954) 4342551
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyaşnain Khan
on behalf of The Islamic Centre, New
Delhi. Printed at Nice Printing Press, 7/10,
Parwana Road, Khureji Khas, Delhi- 110 051.

قدرتی ڈھال

چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو خاں وحشی تاتاری قبائل کی فوج لے کر ۱۲۵۸ء میں بغداد میں داخل ہوا اور اس کو تباہ کر ڈالا۔ اس کے بعد عرصہ تک وہ لوگ مسلم دنیا کو اپنی تخریب کاری کا نشانہ بناتے رہے۔ امام ابن تیمیہ (۱۳۲۸ = ۱۲۶۳ء) کا زمانہ وہی ہے جو اس تاتاری فتنہ کا زمانہ ہے۔ دمشق میں ایک بار ابن تیمیہ ایک مقام سے گزر رہے تھے۔ اس مقام پر تاتاریوں کا ایک گروہ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ اس وقت وہ لوگ شراب نوشی میں مشغول تھے۔ ابن تیمیہ کے بعض ساتھیوں نے چاہا کہ ان کے پاس جائیں اور ان کو شراب پینے سے روکیں۔ ابن تیمیہ نے اپنے ساتھیوں کو منع کیا۔ انہوں نے کہا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ جب تک یہ لوگ نشہ کی حالت میں رہیں گے، مسلمان ان کی جارحیت سے محفوظ رہیں گے۔ ان کی ہوش کی حالت کے مقابلہ میں ان کی مدہوشی کی حالت زیادہ بہتر ہے۔ (مسکوہم خیر من صحوہم)

موجودہ دنیا میں عافیت کی زندگی حاصل کرنے کے لئے یہ ایک قیمتی اصول ہے۔ لوگوں کو ان کی دلچسپیوں میں مشغول رہنے دیجئے، آپ ان کے فتنوں سے محفوظ رہیں گے۔ یہ اصول دور جدید کے تاتاریوں پر مزید اضافہ کے ساتھ چسپاں ہوتا ہے۔ موجودہ صنعتی دور کے تاتاری اس سے بھی زیادہ بڑے نشے میں مبتلا ہیں۔ یہ دولت کمانے کا نشہ ہے۔ جدید صنعتی انقلاب نے دولت کمانے کے بے حساب نئے مواقع کھول دیے ہیں۔ چنانچہ ہر آدمی اپنی ساری توجہ زیادہ سے زیادہ کمائی کرنے میں لگائے ہوئے ہے۔ برادران وطن میں یہ کیفیت اور بھی زیادہ ہے کیوں کہ وہ دولت کو دیوتا کا درجہ دیتے ہیں۔

ایسی حالت میں لوگوں کے شر سے بچنے کی سب سے آسان صورت یہ ہے کہ انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ بعض اوقات صبر و تحمل بہترین ڈھال کی حیثیت رکھتا ہے۔

تدبیر اور توکل

قرآن کی سورہ نمبر ۶ میں ارشاد ہوا ہے: **وَإِن يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِن يَمْسَسْكَ بِنُجُومٍ فَهُوَ عَلِيُّ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (الأنعام ۱۷۱)** یعنی اور اگر اللہ تم کو کوئی دکھ پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں۔ اور اگر اللہ تم کو کوئی بھلائی پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

دکھ کو دور کرنے والا صرف اللہ ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اگر تم کسی دکھ میں مبتلا ہو تو اس سے نجات کے لیے اللہ کے فرشتوں کا انتظار کرو۔ یہ دراصل دکھ کے وقت اعتدال پر قائم رہنے کی تعلیم ہے۔ اگر کسی کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ فوراً کانٹے کو نکالنے کی کوشش کرے۔ اگر وہ بیمار ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ فوراً دوا کا استعمال کرے۔ اعتدال کے دائرہ میں دکھ کو دور کرنے کی کوشش کرنا ایک فطری امر ہے۔ خود فطرت ہی یہ سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ ایسے موقع پر آدمی کو فوراً ضروری تدبیر کی طرف متوجہ ہو جانا چاہئے۔

لیکن اگر ایسا ہو کہ اعتدال کے دائرہ میں فطری تدبیر سے مسئلہ حل ہوتا ہوا نظر نہ آئے تو ایسی حالت میں آدمی کو اللہ سے دعا کرنا چاہئے اور اللہ سے مدد کا طالب ہونا چاہئے۔ اس کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ تدبیر کو ناکافی دیکھ کر وہ مایوسی کا شکار ہو یا قبروں اور درگاہوں کی طرف دوڑنے لگے یا اور کوئی ایسا اقدام کر بیٹھے جو اعتماد علی اللہ کے خلاف ہو۔ انسانی تدبیر کے بعد اللہ پر بھروسہ کرنا ہے نہ کہ کسی غیر اللہ کا سہارا ڈھونڈنا۔ اس کے بعد فرمایا کہ اور اگر اللہ تم کو کوئی بھلائی پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس آیت میں یہ تلقین کی گئی ہے کہ دنیا کی کوئی بھلائی کسی آدمی کو ملے تو وہ اس کو اپنا ذاتی کمال سمجھ کر اس پر نازاں نہ ہو۔ وہ تو واضح کی روش سے نہ بٹے۔ کیوں کہ جو کچھ اس کو ملا ہے وہ اللہ کے اذن سے ملا ہے۔ اللہ جب چاہے، حالات میں ایسی تبدیلی پیدا کر دے کہ ملی ہوئی چیز اس سے چھین جائے۔ اس آیت کی مزید تشریح ایک حدیث سے ہوتی ہے۔

الترمذی نے روایت کیا ہے کہ عبد اللہ بن عباس کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی سواری کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اے لڑکے یا اے میرے بیٹے، کیا میں تم کو ایسی بات نہ بتاؤں کہ اس کے ذریعہ سے اللہ تم کو نفع پہنچائے۔ میں نے کہا کہ ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ تم اللہ کو یاد رکھو، اللہ تمہیں یاد رکھے گا۔ تم اللہ کو یاد کرو، تم اس کو اپنے سامنے پاؤ گے۔ تم خوش حالی میں اللہ کو نہ بھولو، وہ تم کو تنگی میں نہ بھولے گا۔ جب تم مانگو تو اللہ سے مانگو۔ اور جب تم مدد طلب کرو تو اللہ سے مدد طلب کرو۔ کیوں کہ جو ہونے والا ہے وہ سب لکھا جا چکا ہے۔ پس اگر تمام انسان تم کو کوئی تکلیف پہنچانا چاہیں جس کا فیصلہ اللہ نے تمہارے لیے نہ کیا ہو تو وہ اس پر قادر نہ ہوں گے۔ اور اللہ کے لیے عمل کرو شکر اور یقین کے ساتھ۔ اور جان لو کہ جو چیز تم کو ناپسند ہو اس پر صبر کرنے میں تمہارے لیے بہت زیادہ بھلائی ہے۔ اور اللہ کی مدد صبر کے ساتھ ہے۔ اور کشادگی تکلیف کے ساتھ ہے۔ اور بے شک آسانی مشکل کے ساتھ ہے۔ (الجامع لأحكام القرآن للقرطبي ۳۹۸/۵)

ایمانی زندگی تدبیر کے ساتھ توکل کا نام ہے اور توکل کے ساتھ تدبیر کا۔ تدبیر اگر انسانی محنت کا اظہار ہے تو توکل اللہ کے قادر مطلق ہونے کا اظہار۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں انسان کے ساتھ بری حالت بھی پیش آتی ہے اور اچھی حالت بھی۔ اور ان دونوں ہی کا مقصد صرف ایک ہوتا ہے اور وہ آزمائش ہے (و نبلوکم بالشر والخیر فتنة) الانبیاء ۳۵۔

اس سے معلوم ہوا کہ دکھ اور سکھ اگرچہ بظاہر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ مگر اللہ کے تخلیقی منصوبہ کے مطابق، دونوں کی حیثیت ایک ہے اور دونوں کا مقصد بھی ایک ہے۔ اللہ کے تخلیقی منصوبہ کے مطابق، انسان کو چاہئے کہ جب اس پر دکھ کی حالت پڑے تو وہ اپنے سکھ کی حالت کو یاد کرے اور اس طرح اپنے اس اعتماد کو زندہ رکھے کہ اللہ اس کے دکھ کو سکھ میں بدلنے پر قادر ہے۔ اسی طرح جب وہ زندگی میں سکھ کا تجربہ کرے تو وہ اپنے دکھ کے لمحات کو یاد کرے اور اس طرح اس حقیقت کو اپنے ذہن میں تازہ کرے کہ اللہ اگر چاہے تو اس سے سکھ کو چھین لے اور اس کو دکھ کی حالت میں مبتلا کر دے۔

عقیدہ خدا اور سائنس

سائنس اپنی حقیقت کے اعتبار سے عین اسی علم فطرت کا ظہور ہے جس کی خبر پیشگی طور پر قرآن میں ان الفاظ میں دی گئی تھی۔ سنریہم ایاتنا فی الآفاق و فی أنفسہم حتی یبین لهم انه الحق (حم السجدہ ۵۳) یعنی ہم لوگوں کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں اور انفس میں۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ یہ (قرآن) حق ہے۔

سائنس کی جدید تحقیقات کی روشنی میں کائنات کی جو نئی تصویر بنی ہے، وہ عین وہی ہے جو قرآن میں پیشگی طور پر بتادی گئی تھی۔ اس اعتبار سے جدید سائنسی دریافتیں گویا کتاب الہی کے اشارات کی تفصیل ہیں اور اسی کے ساتھ اس کی دلیل بھی۔ یہاں مختصر طور پر ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جدید دریافت کے مطابق، کائنات کی ابتدا تقریباً ۲۵ بلین سال پہلے ہوئی۔ اس کے بعد مختلف تدریجی انقلابات سے گزرتے ہوئے وہ اپنی موجودہ حالت تک پہنچی۔ اس پورے سفر کی روداد اس موضوع کی کتابوں میں پڑھ کر معلوم کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کو محسوس طور پر کسی سائنسی پلے بیئریم (Planetarium) میں دیکھا جاسکتا ہے۔ میں نے یہ پورا منظر واشنگٹن کے نیشنل پلے بیئریم میں دیکھا ہے۔

سائنسی مطالعہ بتاتا ہے کہ ۲۵ بلین سال پہلے خلا میں ایک سپر اینیم ظاہر ہوا۔ یہ ان تمام ذرات (particles) کا مجموعہ تھا جو موجودہ کائنات میں پائے جاتے ہیں۔ گویا موجودہ پوری کائنات ایک بہت بڑے فٹ بال جیسے گولے کی صورت میں شدت کے ساتھ باہمی طور پر چٹھی ہوئی تھی۔ اس گولے کے تمام ذرات بے حد طاقتور کشش کے ساتھ ایک دوسرے سے داخلی طور پر جڑے ہوئے تھے۔ معلوم طبیعیاتی قانون کے مطابق، یہ ناممکن تھا کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو کر بیرونی سمت میں سفر کریں۔

اس وقت اس سپر اینیم کے اندر نہایت طاقتور دھماکہ ہوا۔ اس دھماکہ کے فوراً بعد سپر اینیم

کے ذرات بکھر کر تیزی سے بیرونی سمت میں سفر کرنے لگے۔ اس کے بعد یہ ذرات وسیع خلا میں مختلف مجموعوں کی صورت میں اکٹھا ہو گئے۔ انہیں مجموعوں سے خلا میں پائی جانے والی وہ دنیا کیس نہیں جن کو ستارہ، سیارہ، کہکشاں، شمسی نظام، زمین اور چاند جیسے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔

سپر اینیم کا یہ دھماکہ بیک وقت دو چیزیں ثابت کرتا ہے۔ ایک یہ کہ یہاں کائنات سے الگ ایک طاقتور ہستی پہلے سے موجود تھی جس نے اپنی ارادی مداخلت کے ذریعہ یہ غیر معمولی واقعہ کیا کہ سپر اینیم کے ذرات داخلی رخ پر سفر کے بجائے بیرونی رخ پر سفر کرنے لگے۔

اس واقعہ کا دوسرا عظیم پہلو یہ ہے کہ دھماکہ (explosion) ہمیشہ تخریبی نتائج کا سبب بنتا ہے۔ پناحہ سے لے کر بم تک ہر دھماکہ بلا استثناء یہی خاصیت رکھتا ہے۔ مگر سپر اینیم کا دھماکہ استثنائی طور پر غیر تخریبی تھا۔ اس نے مکمل طور پر صرف صحت مند اور تعمیری نتائج پیدا کئے۔ یہ استثنائی واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کائنات کا خالق لامحدود قدرت کا مالک ہے۔ وہ یہ استثنائی اختیار رکھتا ہے کہ واقعہ کے ساتھ نتائج پر مکمل کنٹرول کر سکے۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ ہماری کائنات ایک پھیلتی ہوئی کائنات (expanding universe) ہے۔ وہ غبارہ کی مانند مسلسل طور پر بیرونی سمت میں پھیل رہی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کا ایک متعین آغاز ہے۔ اگر کائنات ابدی ہوتی تو وہ اپنی اس پھیلتی ہوئی نوعیت کی بنا پر اب تک ختم ہو چکی ہوتی۔ یہ ثابت ہونا کہ کائنات کا ایک آغاز ہے، یہ بھی ثابت کر دیتا ہے کہ اس کا کوئی آغاز کرنے والا ہے۔ ایک غیر موجود چیز کا آغاز اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس سے پہلے کوئی موجود ہو جو اپنے ارادہ سے اس کا آغاز کر سکے۔

کائنات میں ایسے بے شمار شواہد ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ کائنات کا منصوبہ ساز اور اس کا ناظم صرف ایک ہے۔ اگر ایک سے زیادہ ناظم ہوتے تو یقینی طور پر کائنات میں فساد برپا ہو جاتا۔

مثال کے طور پر زمین اور سورج کا فاصلہ تقریباً ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے۔ یہ فاصلہ

مسلط طور پر اپنی حالت پر برقرار رہتا ہے۔ اگر اس فاصلہ میں تبدیلی آجائے تو اس کے مہلک نتائج پیدا ہوں گے۔ مثلاً اگر یہ فاصلہ بڑھ کر ۲۰ کروڑ میل دور ہو جائے تو زمین پر اتنی ٹھنڈ پیدا ہو کہ پانی، نباتات، حیوانات اور انسان سب منجمد ہو جائیں۔ اسی طرح یہ فاصلہ اگر کم ہو کر ۵ کروڑ میل ہو جائے تو زمین پر اتنی گرمی پیدا ہو کہ تمام چیزیں بشمول انسان جل کر ختم ہو جائیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سورج اور زمین دونوں کا خدا ایک ہے۔ اگر دونوں کے خدا الگ الگ ہوتے تو دونوں الگ الگ اپنی مرضی چلاتے اور پھر یقینی طور پر یہ فاصلہ گھٹتا بڑھتا رہتا اور اس بے قاعدگی کی بنا پر زمین پر انسانی تہذیب کا وجود ناممکن ہو جاتا۔

نامعلوم حد تک وسیع کائنات میں ہمارا زمینی سیارہ ایک نادر استثناء ہے۔ یہاں پانی اور ہوا اور نباتات جیسی ان گنت چیزیں پائی جاتی ہیں جو انسانی زندگی کے لئے لازمی طور پر ضروری ہیں۔ جب کہ وسیع خلا میں معلوم طور پر کوئی بھی ایسی دنیا موجود نہیں جہاں بقائے حیات کا یہ سامان پایا جاتا ہو۔ یہ استثناء بتاتا ہے کہ یہ دنیا محض بے شعور مادہ کے ذریعہ نہیں بنی بلکہ وہ ایک باشعور ہستی کا تخلیقی کرشمہ ہے۔ اگر وہ محض مادی قوانین کے بے شعور تعامل کا نتیجہ ہوتی تو کائنات میں بہت سی ایسی زمینیں ہوتیں نہ کہ صرف ایک ایسی زمین۔

ہماری دنیا کی ہر چیز انتہائی حد تک بامعنی ہے۔ چیزوں کی معنویت یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ دنیا ایک باشعور تخلیق کا نتیجہ ہے۔ کوئی دوسرا نظریہ اس حکمت اور معنویت کی توجیہ نہیں کر سکتا۔ مثلاً زمین کے حجم (سائز) کو لیجئے۔ زمین کا موجودہ حجم تقریباً ۲۵ ہزار میل کی گولائی میں ہے۔ یہ حجم بے حد بامعنی ہے۔ چنانچہ یہ حجم اگر ۵۰ ہزار میل ہو تا تو زمین کی کشش اتنی زیادہ بڑھ جاتی کہ وہ انسانی جسم کی بڑھوتری کو روک دیتی۔ اس کے بعد زمین پر صرف بالشتیے قسم کے انسان دکھائی دیتے۔ اس کے برعکس اگر زمین کا حجم گھٹ کر ۱۲ ہزار میل ہو تا تو اس کی قوت کشش اتنی کم ہو جاتی کہ وہ انسانی بڑھوتری کو روک نہ سکتی۔ انسان کا قد تاڑکی طرح لمبا ہو جاتا۔ اس کے سوا اور بے شمار قسم کے غیر موافق حالات پیدا ہوتے جو انسان کی تمام تمدنی ترقیوں کو ناممکن بنا دیتے۔

مذکورہ پہلوؤں پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ سائنسی اعتبار سے، یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ اس دنیا کا ایک خالق ہے اور وہ یقینی طور پر صرف ایک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہمارے لئے جو انتخاب ہے وہ با خدا کائنات (universe with God) اور بے خدا کائنات (universe without God) میں نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے لیے حقیقی انتخاب با خدا کائنات (universe with God) اور غیر موجود کائنات (no universe at all) میں ہے۔ یعنی اگر ہم خدا کے وجود کا انکار کریں تو ہم کو کائنات کے وجود کا بھی انکار کرنا پڑے گا۔ چون کہ ہم کائنات کے وجود کا انکار نہیں کر سکتے اس لیے ہم خدا کے وجود کا بھی انکار نہیں کر سکتے۔ اس معاملہ میں ہمارے لیے دوسرا کوئی ممکن انتخاب موجود نہیں۔

Change of Telephone Numbers

New Numbers:

Office Al-Risala	435 1128, 435 5454
Maulana Wahiduddin Khan	435 8729
Fax	435 7333, 435 7980
e-mail	info@goodwordbooks.com

میر ٹھہ کا سفر

میر ٹھہ مجھے بار بار جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ تاہم سفر نامہ کی نسبت سے پانچ سفر قابل ذکر ہیں۔ اس حیثیت سے میر ٹھہ کے لئے میرا پہلا سفر جنوری ۱۹۶۸ میں ہوا۔ اس سفر کی روداد اُس زمانہ میں الجمعیتہ ویلکی ۹ فروری ۱۹۶۸ میں شائع ہوئی تھی۔

میر ٹھہ کے لئے میرا دوسرا سفر جون ۱۹۷۹ میں ہوا۔ اس موقع پر وہاں میری چند تقریریں ہوئیں اور مختلف اہل علم سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اس سفر کا ایک واقعہ اللہ اکبر (صفحہ ۹۰) میں درج ہے۔

میر ٹھہ کے لئے میرا تیسرا سفر جون ۱۹۸۷ میں ہوا۔ یہ سفر خاص طور پر میر ٹھہ کے فساد کا جائزہ لینے کے لئے کیا گیا تھا۔ اس سفر کی تفصیلی روداد الرسالہ نومبر ۱۹۸۸ میں چھپ چکی ہے۔ میر ٹھہ کا چوتھا سفر سر دھنہ کے سفر کے ذیل میں ہوا۔ اس سفر میں کچھ نئے اور انوکھے قسم کے تجربات ہوئے۔ اس سفر کی تفصیلی روداد الرسالہ نومبر ۱۹۹۶ میں خصوصی نمبر کے طور پر شائع ہوئی۔

میر ٹھہ کے لئے میرا پانچواں سفر ۱۰ ستمبر ۲۰۰۰ کو ہوا۔ اس پانچویں سفر کی مختصر روداد یہاں درج کی جاتی ہے۔

میر ٹھہ مغربی یوپی کا ایک شہر ہے۔ جو دہلی سے ۷۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ابتدائی چار اسفار کی نوعیت موجودہ سفر سے مختلف تھی۔ پچھلے اسفار عام اداروں اور تنظیموں کی دعوت پر ہوئے۔ موجودہ پانچویں سفر کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ حلقہ الرسالہ کی دعوت اور اس کے انتظام کے تحت ہوا۔

میر ٹھہ میں اللہ کے فضل سے الرسالہ مشن کا ایک مؤثر حلقہ بن گیا ہے۔ ان لوگوں کی مخلصانہ دعوت پر یہ سفر ہوا۔ اس سفر میں میرے ساتھ مولانا محمد عرفان قاسمی

(میرٹھ) اور مولانا محمد راشد خاں قاسمی (منڈولی) تھے۔

میرٹھ میں نوجوانوں کا ایک گروپ ہے جو مثبت فکر کی بنیاد پر اکٹھا ہوا ہے۔ وہ تعمیر اور دعوت کے میدان میں خاموش کام کر رہا ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ لمبی مدت سے میرٹھ کی تصویر ایک پر تشدد شہر کی بنی ہوئی ہے۔ ہم اللہ کی مدد سے اس تصویر کو بدلیں گے اور میرٹھ کو امن کا شہر بنائیں گے۔

مولانا محمد عرفان قاسمی نے بذریعہ ٹیلی فون بتایا تھا کہ اس گروپ کی خواہش ہے کہ میں میرٹھ کا سفر کروں۔ اور وہاں کچھ وقت ان نوجوانوں کے ساتھ گزاروں۔ میں نے اس دعوت کو فوراً منظور کر لیا۔ اگرچہ آج کل میرا یہ حال ہے کہ میں اپنے کچھ علمی کاموں میں اتنا زیادہ مشغول ہو گیا ہوں کہ اسفار کا سلسلہ بہت کم کر دیا ہے۔ اس دوران میں نے بہت سے ملکی اور غیر ملکی سفر کے دعوت نامے قبول نہیں کئے۔ اگست - ستمبر ۲۰۰۰ کے لئے مجھے کئی بیرونی کانفرنسوں میں شرکت کے دعوت نامے موصول ہوئے۔ مثلاً پرنگال، فلسطین، نیویارک، اور انڈونیشیا، وغیرہ۔ مگر میں وہاں نہ جاسکا۔ لیکن میرٹھ کے نوجوانوں کے تعمیری اور دعوتی جذبات میرے لئے اتنا زیادہ پرکشش ثابت ہوئے کہ میں ان کی دعوت کو قبول کئے بغیر نہ رہ سکا۔

اس پروگرام کے مطابق ۱۰ ستمبر ۲۰۰۰ کی صبح کو دہلی سے میرٹھ کا سفر کیا اور ۱۵ ستمبر کی رات کو وہاں سے واپسی ہوئی۔ ہم لوگ دہلی سے روانہ ہوئے تو سورج طلوع ہو چکا تھا۔ اس کی روشنی چاروں طرف پھیلتی ہوئی دکھائی دی۔ اس منظر کو دیکھ کر مولانا محمد عرفان صاحب نے کہا کہ اس پروگرام کے لئے میں میرٹھ سے روانہ ہوا تو رات کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اب ہم دہلی سے میرٹھ کا سفر کر رہے ہیں تو ہر طرف روشنی پھیل چکی ہے۔ یہ گویا علامت ہے جو بتا رہی ہے کہ ہمارا تاریک دور بہت جلد ختم ہونے والا ہے اور عنقریب ہمارے لئے روشن دور کا آغاز ہونے والا ہے۔ بلکہ اس کا آغاز ہو چکا ہے۔

دہلی کی سڑکوں پر ہماری گاڑی دوڑ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف درخت کے سرسبز مناظر تھے۔ ان درختوں کے پیچھے دونوں طرف جدید طرز کی عمارتیں جھانکتی دکھائی دے رہی تھیں۔ ان سب کے اوپر سورج ایک عالمی چراغ کی مانند ہر طرف روشنی بکھیر رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد دوڑتی ہوئی گاڑیاں سڑک پر نظر آتی تھیں۔

میں نے سوچا کہ اگر ہم آج سے پانچ سو سال پہلے اس راستہ پر چل رہے ہوتے تو اس وقت یہاں منظر بالکل دوسرا ہوتا۔ کچھلی صدیوں میں دنیائے ”غیر متمدن دور“ سے نکل کر ”متمدن دور“ میں قدم رکھا ہے۔ تاہم اس ظاہری ترقی کے باوجود آج کے مسائل، ماضی کے مسائل کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں۔

پچھلے دور کا انسان سکون کی زندگی گزارتا تھا، آج کسی کو سکون حاصل نہیں۔ پچھلے دور میں انسانی قدریں زندہ تھیں، مگر آج کے زمانہ میں ان کا وجود بہت کم نظر آتا ہے۔ پچھلے دور کے انسان کے پاس مذہب اور اخلاق کے لئے کافی وقت ہوتا تھا، مگر آج کا انسان مادی بھاگ دوڑ میں اتنا مصروف ہے کہ مذہب اور اخلاق جیسی چیزوں کے لئے اس کے پاس کوئی وقت نہیں۔

میں اس سوال پر غور کر رہا تھا کہ ہماری گاڑی کے پاس سے ایک بھاری ٹرک گزرا، اس کے انجن سے نکلنے والا تیز دھواں ہماری گاڑی کی کھڑکی سے اندر داخل ہوا۔ اس تیز دھواں نے تھوڑی دیر کے لئے میرے ذہن کو منتشر کر دیا۔ مگر اسی تلخ تجربہ میں میرے سوال کا خاموش جواب بھی چھپا ہوا تھا۔ ٹرک کا کثیف دھواں گویا جھنجھوڑنے والی زبان میں میرے سوال کا جواب تھا۔ یہ دھواں میرے لئے جدید تہذیب کی ایک پر شور علامت بن گیا۔ اس نے علامتی طور پر مجھے بتایا کہ جدید تہذیب اگرچہ بظاہر خوشنما ترقیوں لائی ہے مگر اسی کے ساتھ وہ بے شمار مشینی برائیاں بھی لائی ہے۔ اس کی ایک مثال ٹرک کا یہ کثیف دھواں ہے۔

میں نے اپنے دل میں سوچا کہ قدیم زمانہ میں انسان نے ”جنتِ شداد“ جیسے افسانے بنائے۔ اور پریوں کی کہانیاں لکھیں۔ یہ گویا انسان کی چھپی ہوئی تمنا کا اظہار تھا کہ وہ اسی دنیا میں اپنی جنت تعمیر کر سکے۔ جدید سائنسی و صنعتی انقلاب کے بعد جو بے شمار قسم کی مادی ترقیاں ظہور میں آئیں اس نے گویا قدیم انسان کی آرزوؤں کو واقعہ بنا دیا۔ اب ”جنتِ شداد“ بھی عملاً تعمیر ہو گئی اور پریوں کی دنیا بھی اب ایک ایسا عمومی واقعہ ہے جس کو ہر آدمی تصویروں کی صورت میں اخبار، ٹی وی اور سینما وغیرہ کے ذریعہ دیکھ رہا ہے۔

مگر عین اسی وقت انسان کو محسوس ہوا کہ ان ظاہری ترقیوں نے اس سے وہی اصل چیز چھین لی ہے جو اس کو سب سے زیادہ مطلوب تھی، یعنی خوشی اور سکون۔ یہ سوچتے ہوئے مجھے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد یاد آیا جو آپ نے غزوہ خندق کے موقع پر فرمایا تھا۔ اللھم لا عیش الا عیش الآخرة۔

دور جدید اپنی تمام ظاہری ترقیوں کے ساتھ گویا اس ارشادِ رسول کی تفسیر ہے۔ سکون و مسرت سے خالی یہ خوشنامادی ترقیاں گویا خاموش زبان میں یہ اعلان کر رہی ہیں کہ انسان جو پُر راحت اور پُر مسرت زندگی چاہتا ہے وہ صرف آخرت کی دنیا میں مل سکتی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ موجودہ دنیا کے وسائل کو جنت کی تعمیر میں لگائے: لَمْثَلِ هَذَا لِيَعْمَلِ الْعَامِلُونَ (الصافات ۶۱) مولانا محمد عرفان قاسمی (۴۰ سال) ۱۹۸۰ء سے الرسالہ کا مسلسل مطالعہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے الرسالہ کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ الرسالہ بند ذہن کو کھولتا ہے اور ذہنی وجود کو توڑ کر اس کو آفاقی بناتا ہے۔

الرسالہ پڑھنے سے پہلے مجھے ایسا معلوم ہوا تھا کہ امت مسلمہ کا سفر ایک بندگلی میں پہنچ کر رک گیا ہے۔ دوسرے اخبارات و رسائل اور جلسوں کی تقریروں سے یہی سبق ملتا تھا۔ مگر جب میں نے الرسالہ پڑھنا شروع کیا تو ایسا محسوس ہوا کہ میں کھلی شاہراہ پر آ گیا ہوں۔ اب ہر طرف تاریکی کے بجائے روشنی اور تنگی کے بجائے کشادگی نظر آنے لگی۔

ہماری گاڑی چلتی ہوئی مودی نگر کے صنعتی شہر میں پہنچی جو دہلی اور میرٹھ کے درمیان واقع ہے۔ میرے شریک سفر مولانا محمد راشد خاں قاسمی (۳۰ سال) نے بتایا کہ میری پیدائش اسی مودی نگر میں ہوئی۔ میرے والد عبدالعید خاں مرحوم (وفات ۱۹۹۷) یہاں سروس کرتے تھے۔ میں نے مولانا محمد راشد صاحب سے پوچھا کہ الرسالہ مشن کے بارے میں آپ کا تاثر کیا ہے۔ انہوں نے ان الفاظ میں اپنا تاثر بتایا کہ جب میں مظاہر العلوم سہارنپور میں (۱۹۸۳-۸۷) میں زیر تعلیم تھا تو مولانا محمد عرفان قاسمی نے جو میرے استاذ بھی ہیں، اپنی طرف سے میرے نام الرسالہ جاری کر دیا۔ جب میں نے الرسالہ پڑھنا شروع کیا تو ابتداء میں مجھے اس کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہوئے، خاص طور پر اس بات پر کہ الرسالہ میں ہمیشہ صبر کی بات کی جاتی ہے جب کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ساری دنیا میں مسلمانوں کے اوپر ظلم و ستم کیا جا رہا ہے۔ ایسے میں صبر کی تلقین کرنا گویا مسلمانوں کو اُلٹی خوراک دینا ہے۔ تاہم میں ان شکوک کے باوجود الرسالہ پڑھتا رہا۔ آخر کار مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ الرسالہ میں جو بات کہی جاتی ہے وہ ہمیشہ قرآن و حدیث کے حوالہ سے کہی جاتی ہے۔ وہ الرسالہ کی ذاتی بات نہیں ہوتی۔

پھر مجھے محسوس ہوا کہ جب میں دوسروں کی تحریریں پڑھتا ہوں تو ان میں ہمیشہ لڑائی جھگڑا اور نفرت و تشدد ملتا ہے۔ ان تحریروں میں نہ سکون کا سامان ہوتا ہے اور نہ ان سے مستقبل کے بارے میں روشنی ملتی ہے۔ اس کے برعکس الرسالہ کی تحریروں میں ذہنی اطمینان کا سامان ہوتا ہے، اور اسی کے ساتھ ایسی واضح رہنمائی ہوتی ہے جس سے راستے روشن ہوں اور عمل کے مواقع نظر آئیں۔ اب میری شدید خواہش یہ ہے کہ اللہ کی توفیق سے آخر عمر تک اس مشن سے جڑا رہوں اور اس کے مثبت پیغام کو ساری دنیا میں پہنچاؤں۔

مولانا محمد راشد خاں نے بتایا کہ میرے والد عبدالعید خاں صاحب مرحوم اچھے

تعلیم یافتہ اور ذہین شخص تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں والد صاحب کے آخری زمانہ میں ان کو الرسالہ پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ وہ اس کے مضامین کو سن کر بہت خوش ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ بیٹے تم اس کو ضرور پڑھا کرو۔

انہوں نے کہا کہ میرے والد صاحب نے مختلف ملکوں کا سفر کیا تھا۔ مسلم دنیا میں انہوں نے ہر جگہ ظلم و تشدد کے تذکرے سنے تھے۔ مسلم رہنماؤں کی بھڑکیلی تقریروں اور جوشیلی تحریروں سے وہ بہت تالاں تھے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے مسائل کے لئے وہ خود ان کے رہنماؤں کو ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔ جب ان کو الرسالہ ملا تو انہیں محسوس ہوا کہ یہ عین وہی چیز ہے جسے ان کی فطرت تلاش کر رہی تھی۔ جب بھی الرسالہ کا تیار ہوا آتا تو وہ اس کو پڑھ کر بہت خوش ہوتے اور بار بار اس کے لئے دعائیں کرتے۔ راستہ میں مولانا محمد عرفان قاسمی صاحب نے بتایا کہ میلہ لوچندی (میرٹھ) کے ترنگے گیٹ پر پہنچنے پر ہمارے ساتھی آپ کا استقبال کرنا چاہتے ہیں۔ وہ وہاں کھڑے ہوئے آپ کو ملیں گے۔ انہوں نے مولانا محمد عرفان صاحب سے پوچھا تھا کہ ہم ان کو ہارڈ الٹا چاہتے ہیں۔ ہارڈ الٹا جائز ہے یا ناجائز۔

میں نے یہ بات سنی تو میں نے کہا کہ مجھے ذاتی طور پر اس قسم کی نمائشی چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مگر اسی کے ساتھ میری رائے یہ ہے کہ ہر چیز کو جائز اور ناجائز کا سوال بنانا خود ناجائز ہے۔ کیوں کہ فقہ اسلامی کا مسئلہ مسئلہ ہے کہ الاصل فی الاشیاء الإباحہ (چیزوں کی اصل ان کا مباح ہونا ہے)

سفر کرتے ہوئے ہم لوگ میرٹھ پہنچے تو گھڑی میں ۹ بج چکے تھے۔ یہاں سڑک کے کنارے الرسالہ کے قارئین کا ایک گروہ موجود تھا۔ ان سے ملاقات کے بعد ہم لوگ جناب محمد شہزاد علی خاں صاحب کے مکان (شاستری نگر) پہنچے۔ یہاں تقریباً دو گھنٹہ قیام رہا۔ میرٹھ کے قارئین الرسالہ یہاں جمع ہو گئے۔ ان کی تعداد تقریباً ۳۰ تھی۔

ان لوگوں کی طرف سے مختلف قسم کے سوالات پیش کئے جاتے رہے جن کے جواب میں نے قرآن و حدیث کی روشنی میں دئے۔ صحیح بخاری (کتاب الرضی) کی ایک حدیث نقل کرتے ہوئے میں نے کہا کہ مؤمن کی صفت خاص یہ ہے کہ اس کے اندر اکڑ نہیں ہوتی۔ وہ تواضع اور فروتنی میں جیتا ہے۔ اللہ کی عظمت کا یقین اور آخرت کی جواب دہی کا احساس اس سے اکڑ کی نفسیات چھین لیتا ہے۔ پھر میں نے کہا کہ اکڑ کی نفسیات نہ ہونا کوئی کمزوری کی بات نہیں ہے۔ اس دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور انسان وہ ہے جو اکڑ جیسے جذبات سے خالی ہو جائے۔

ایک اور سوال کے جواب میں، میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے مسائل کا واحد حل دعوت ہے۔

انسان کے اندر اعلیٰ صفات پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے سامنے ایک اعلیٰ مشن ہو۔ اعلیٰ مشن ہی وہ واحد کلید ہے جو کسی شخص کے اندر اعلیٰ انسانی صفات پیدا کرتی ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں اگر دعوت کی اسپرٹ صحیح معنوں میں پیدا ہو جائے تو ان کے اندر دینی اسپرٹ بھی آجائے گی۔ اور اتحاد و اتفاق بھی پیدا ہوگا۔ اخلاقی اور انسانی صفات بھی پیدا ہوں گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ دعوتی کام کی بنا پر اللہ کی خصوصی رحمتوں کے مستحق قرار پائیں گے۔

ایک اور سوال کے جواب میں، میں نے کہا کہ یہ نظریہ غلط ہے کہ پہلے اپنی اصلاح کرو اور پھر دعوت کا کام کرو۔ ابن کثیر نے اپنی تفسیر (جلد اول صفحہ ۸۱) میں لکھا ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ دعوت کے لئے ذاتی اصلاح شرط نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک غیر عملی شرط ہے۔ اگر لوگوں کے دل میں یہ بٹھا دیا جائے کہ اپنی اصلاح کی تکمیل سے پہلے دعوتی کام نہ کرنا چاہئے تو دعوتی کام کبھی وجود میں نہیں آئے گا، ایک حقیقی مومن کبھی بھی یہ یقین نہیں کر سکتا کہ اس کی اصلاح ہو گئی، کیوں کہ حقیقی مومن اللہ سے

ڈرنے والا انسان ہوتا ہے۔ وہ سب کچھ کرنے کے باوجود یہ سمجھتا ہے کہ اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ گویا کہ مومن وہ ہے جو ہمیشہ اپنے آپ کو غیر اصلاح یافتہ سمجھے۔ ایسی حالت میں دعوت کا کام ہمیشہ رکارہ ہے گا۔ اگر اہل ایمان ہمیشہ اپنے بارے میں یہ سمجھتے رہیں کہ میں تو ایک غیر اصلاح یافتہ انسان ہوں تو پھر میں دعوت کا کام کیسے کروں۔ اس لئے ضروری ہے کہ دعوت عام اور ذاتی اصلاح کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا جائے۔

پھر میں نے کہا کہ دعوت کی سب سے زیادہ اہم اور لازمی شرط یہ ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان نفرت اور بے زاری کی فضا نہ ہو بلکہ معتدل فضا ہو، یہی چیز دعوت کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے کہا کہ مسلمانوں پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ یک طرفہ صبر و اعراض کے ذریعہ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان تلخی کو دور کریں۔ مفروضہ اور غیر مفروضہ ہر قسم کی زیادتیوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کرتے ہوئے دعوت کا ماحول پیدا کریں۔ یہ خدا نخواستہ بزدلی کی بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک عظیم ترین عبادت ہے۔ جو شخص اس روش کا ثبوت دے اس کو بے حساب اجر عطا کیا جائے گا۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ ابھی تک زیادہ تر ذاتی طور پر کام کر رہے ہیں، آپ نے کوئی بڑا ادارہ نہیں بنایا۔ میں نے کہا کہ اگر سالہ مشن سے وابستہ لوگوں کا حلقہ اللہ کے فضل سے ہر جگہ موجود ہے، جیسا کہ خود میرٹھ میں آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہی ہمارا ادارہ ہے۔ درود یوار کی صورت میں جو بڑے بڑے ادارے قائم ہوتے ہیں وہ کوئی بہت اچھی علامت نہیں۔ اس قسم کے ادارے ہمیشہ کسی امت کے دور زوال میں بنائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی نبی کی زندگی میں موجودہ قسم کے بڑے بڑے ادارے قائم نہیں ہوئے۔ پیغمبر کی زندگی میں اس کا مشن اسپرٹ کے زور پر چلتا ہے۔ اس زمانہ میں اسپرٹ ہی ادارہ کا قائم مقام ہوتی ہے۔ بعد کی نسلوں میں جب اسپرٹ

کمزور پڑ جاتی ہے اور خواہر پسندی بڑھ جاتی ہے، اس وقت بڑی بڑی عمارتیں بنتی ہیں اور عالیشان ادارے قائم ہوتے ہیں۔ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو یہ ادارے دراصل روح دین کا قبرستان ہوتے ہیں۔ ان عالیشان اداروں میں بظاہر سب کچھ ہوتا ہے مگر وہی چیز نہیں ہوتی جو اصلاً مطلوب ہے، یعنی دین کی روح اور اس کی اسپرٹ۔ اسی حقیقت کو اقبال نے خدا کی طرف سے اس طرح بیان کیا ہے۔

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو
مسٹر ایس شفیق احمد ایڈوکیٹ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ مسلم معاشرہ
میں صہبت، طبقہ واریت اور ذات پات کے رجحان سے ملت کو منتشر و منقسم کیا جا رہا
ہے۔ اس سیاسی حربہ سے مسلم کی حفاظت کے لئے دعوت کا کیا لائحہ عمل ہے۔

میں نے کہا کہ ایک درخت سوکھ رہا ہو تو اس کو دوبارہ ہرا کرنے کے لئے ایک سو
ایک نسخے نہیں ہوتے بلکہ ایک ہی صحیح نسخہ ہوتا ہے، وہ یہ کہ اس کی جڑوں کو پانی
دیا جائے۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں جو کمیاں ہیں وہ سب کی سب اس
لئے ہیں کہ وہ ایک بے حقیقت گروہ بن کر رہ گئے ہیں۔ فرد کا معاملہ ہو یا قوم کا معاملہ،
دونوں ہی کے لئے اصلاح کا نسخہ صرف ایک ہے وہ یہ کہ ان کو ایک اعلیٰ مقصد پر کھڑا
کر دیا جائے۔ اعلیٰ مقصد اپنے آپ تمام انسانی صفات پیدا کر دیتا ہے۔ ہم مسلمانوں کو اسی
اعلیٰ مقصد پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں اور وہ مقصد بلاشبہ دعوت الی اللہ ہے۔ جس دن
مسلمانوں میں دعوت الی اللہ بطور مقصد شامل ہو جائے، تو بقیہ تمام صفات اپنے آپ ان
کے اندر پیدا ہو جائیں گی۔

ساڑھے گیارہ بجے ہم لوگ مسجد الفاروق (زیدی فارم) پر پہنچے، یہاں عمومی
جلسہ رکھا گیا تھا۔ مسلمانوں کے علاوہ، کچھ غیر مسلم حضرات بھی موجود تھے۔ یہ جلسہ
تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہا۔ اس جلسہ میں تقریر کا عنوان اسلام اور امن تھا۔ میں

نے کہا کہ امن کی تعریف عام طور پر جنگ کی غیر موجودگی (absence of war) کی جاتی ہے۔ مگر یہ تعریف ادھوری ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ امن ایک طریق کار ہے۔ اور طریق کار کے اعتبار سے امن کو بہر حال جنگ اور تشدد پر فوقیت حاصل ہے۔

چنانچہ صحیح البخاری میں ایک حدیث آتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: **إِنَّ اللَّهَ يَعْطِي عَلَى الرَّفْقِ مَالًا يَعْطِي عَلَى الْعَنْفِ**۔ (اللہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو وہ سختی پر نہیں دیتا) پوری انسانی تاریخ اس قول رسول کی صداقت کی تصدیق کرتی ہے۔ تاریخ کی تمام بڑی بڑی کامیابیاں امن کے ذریعہ حاصل ہوئی ہیں۔ جنگ کے ذریعہ کوئی حقیقی کامیابی کبھی کسی کو نہیں ملی۔

امن کا ایک طاقت ہونا اسلام کی پوری تاریخ سے ثابت ہوتا ہے۔ دور اول میں سوالاکھ صحابہ کا جو قیمتی گروہ بنا تھا وہ سب سب کا سب پر امن جید و جہد کے ذریعہ بنا تھا۔ جن لوگوں کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے وہ چار قسم کے لوگ تھے۔ مہاجرین، انصار، مطلقاء اور واندین۔

مہاجرین وہ ہیں جو مکہ کی تیرہ سالہ مدت میں اسلام لائے، جب کہ اس پوری مدت میں کبھی جنگ نہیں ہوئی۔ انصار وہ لوگ ہیں جو مدینہ کے قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ جیسا کہ معلوم ہے، مدینہ پر کبھی فوج کشی نہیں کی گئی۔ مطلقاء ان مسلمانوں کو کہا جاتا ہے جو فتح مکہ کے بعد مکہ میں اسلام لائے۔ یہ لوگ بھی جنگ کے بغیر اسلام میں داخل ہوئے۔ کیوں کہ فتح مکہ کے وقت اور نہ اس کے بعد وہاں کوئی جنگی طاقت استعمال کی گئی۔ اس کے بعد واندین کا دور ہے۔ ہجرت کے آخری سالوں میں عرب کے قبائل سے کثرت سے وفود مدینہ آئے اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔

یہ واندین بھی جنگ کے ذریعہ نہیں بلکہ پر امن تبلیغ کے ذریعہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ یہی معاملہ اسلام کی تاریخ میں بار بار پیش آتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر تیرہویں صدی عیسوی میں تاتاری سرقد سے لے کر حلب تک مسلم دنیا پر قابض ہو گئے۔

اس وقت وہ اتنا زور آور تھے کہ ان کے مقابلہ میں جنگ کا کوئی سوال نہ تھا مگر اسلام کی پر امن دعوتی طاقت ظاہر ہوئی اور اس نے بیشتر تاریخوں کو اسلام میں داخل کر دیا۔

مسجد کے اس جلسہ میں مولانا محمد عرفان قاسمی نے بھی تقریر کی۔ ان کی تقریر کا خلاصہ انہی کے الفاظ میں یہاں نقل کیا جاتا ہے: ”یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے درمیان داعی الی اللہ مولانا وحید الدین خاں موجود ہیں۔ آپ حلقہ رسالہ کی دعوت پر یہاں آئے ہیں۔ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتایا جائے کہ رسالہ کا مشن کیا ہے۔ رسالہ فکر کی کئی تعریفیں کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً کہا جاسکتا ہے کہ رسالہ حقیقت پسندی کی تعلیم دیتا ہے۔ یا لوگوں کو باشعور بناتا ہے یا اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک فکر رسالہ کی صحیح تعریف یہ ہے کہ رسالہ فکر نام ہے مسائل انسانی کے قرآنی حل کا۔ یعنی انسانیت کو جو مسائل درپیش ہیں ان کا قرآنی حل کیا ہے وہ رسالہ میں بتایا جاتا ہے۔ میرے ذہن میں شروع ہی سے ایک سوال تھا کہ قرآن تمام مسائل کا حل ہے لیکن اس کے باوجود مسلم قوم سب سے زیادہ مسائل سے دوچار ہے۔ تو ایسا کیوں ہے۔ میں نے اس نقطہ نظر سے رسالہ کا مطالعہ کیا تو میں نے پایا کہ رسالہ تمام مسائل میں قابل فہم قرآنی رہنمائی دیتا ہے۔ میں تقریباً بیس سال سے رسالہ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ ان بیس سالوں میں تقریباً ۱۵ سال میں نے سخت تنقیدی انداز میں اس کا مطالعہ کیا۔ میں سوچتا تھا کہ اگر مجھے کوئی بات قرآن و حدیث کے خلاف نظر آئی تو میں رسالہ کو فوراً چھوڑ دوں گا۔ لیکن اس دوران سچائی مجھ پر ظاہر ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ مولانا صاحب جو کچھ کہتے ہیں وہ صرف قرآن و حدیث کی بات کہتے ہیں۔ قرآن و حدیث سے ہٹ کر وہ کچھ بھی نہیں کہتے۔“

مسجد میں تقریر کے بعد سوال و جواب کا دور شروع ہوا۔ ایک سوال یہ تھا کہ دستوری طور پر ہمارے جو حقوق ہیں حکومت اس پر ایمانداری سے عمل نہیں کر رہی ہے

بلکہ اس کے قول و عمل میں تضاد ہے، ہم کو کیا کرنا چاہئے۔

میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ کسی گروہ کو اس کا حق نہ دستور کے ذریعہ ملتا ہے، اور نہ کسی حکومت کے ذریعہ۔ اس معاملہ میں اصل چیز داخلی اہلیت ہے۔ اگر اس گروہ کے اندر اہلیت ہے تو اس کو اس کا واقعی حق مل کر رہے گا۔ اور اگر اہلیت نہیں ہے تو کوئی بھی دوسری چیز اس کے کام آنے والی نہیں۔

ایک سوال، مسلم مسائل کے متعلق تھا۔ کہا گیا کہ انتظامیہ اور پولیس اپنے فرائض متعصبانہ انداز سے انجام دیتی ہے۔ حتیٰ کہ تشدد تک کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے اس قسم کے نظریہ سے اتفاق نہیں۔ یہ سب اخباری باتیں ہیں۔ میرا یقین قرآن کی اس آیت پر ہے جس میں کہا گیا ہے کہ تم کو جو بھی مصیبت آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہی عمل کا نتیجہ ہوتی ہے (الشوریٰ ۳۰) اس آیت کے مطابق، ہر مصیبت کا اصل سبب خود آدمی کے اندر ہوتا ہے نہ کہ اس کے باہر۔ ایسی حالت میں ہمارا کام احتساب خویش ہونا چاہئے نہ کہ احتساب غیر۔

ایک اور سوال یہ تھا کہ آپ جو صبر و اعراض کی تلقین کرتے ہیں آخر کار یہ کب تک۔ میں نے کہا کہ یہ سوال ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ خدا کی عبادت کب تک۔ صبر کوئی بزدلی نہیں، وہ ایک عبادت ہے، بلکہ وہ افضل ترین عبادت ہے (الزمر ۱۰)۔ ایسی حالت میں آپ کو چاہئے کہ صبر کے مواقع کو بشارت کے روپ میں لیں، اس کو اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا ایک تحفہ سمجھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر ایک ایجابی عمل ہے نہ کہ کوئی سلبی عمل۔ وہ ساری عمر جاری رہتا ہے۔

ایک سوال یہ تھا کہ انفرادی اور اجتماعی دعا کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔
لاؤڈ اسپیکر پر دعا کرنا کیسا ہے۔

میں نے کہا کہ دعا خدا اور بندے کے درمیان کا ایک معاملہ ہے، اس لئے اصلاً دعا

کو تہجائی اور خاموشی کی صورت میں ہونا چاہئے۔ لیکن ہر عموم میں استثناء ہوتا ہے۔ اس لئے کسی ضرورت یا مصلحت کے تحت جبری دعا کی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس مسئلہ کی تفصیل تفسیر روح المعانی میں سورہ الاعراف آیت ۵۵ کے تحت دیکھی جاسکتی ہے۔ ایک سوال یہ تھا کہ آپ کس عالم کی تفسیر سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں اور کس تفسیر کو زیادہ بہتر تصور کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ قرآن کی تفسیریں کثرت سے لکھی گئی ہیں۔ ہر تفسیر کی کوئی نہ کوئی انفرادی خصوصیت ہے اور ہر ایک سے اپنے ذوق کے مطابق استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ میں خود ہر تفسیر کو دیکھتا ہوں۔ تاہم القرطبی کی الجامع لاحکام القرآن زیادہ تر میرے مطالعہ میں رہتی ہے۔ اس تفسیر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تفسیری روایات اور سلف کے اقوال یکجا مل جاتے ہیں۔ اس سے آیات کا مطالعہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

ایک سوال موجودہ صورت حال کے تحت مسلمانوں کی ملی اور سیاسی قیادت کے بارے میں تھا۔ مسلمانوں میں قیادتی قحط کیوں ہے۔ میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان جس مسئلہ سے دوچار ہیں وہ فقدان قیادت نہیں ہے بلکہ فقدان قبولیت قیادت ہے۔ قوم کی قبولیت سے کوئی شخص قائم بنتا ہے۔ جب قوم میں قبولیت کا مزاج ہی نہ ہو تو کوئی قائم کس طرح قائم بنے گا۔

میرٹھ میں شام کے وقت جناب سید محمود علی صاحب (شاستری نگر) کے مکان پر ایک پریس کانفرنس ہوئی جس میں ہندی اخباروں کے نمائندے شریک ہوئے۔ پریس کانفرنس میں بہت سے سوالات کئے گئے جن کا میں نے جواب دیا۔ ایک سوال مسلمانوں کے دینی مدارس کے بارے میں تھا۔ میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں نے دینی مدارس پر اپنے میگزین "الرسالہ" (ستمبر ۲۰۰۰) میں تفصیل سے لکھا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ مدارس ملک کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔ یہ مدارس گویا اچھے شہری تیار کرتے ہیں۔

بابری مسجد کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ بابری مسجد کا مسئلہ ختم نہیں ہوا۔ وہ ابھی تک عدالت میں موجود ہے، اور جو مسئلہ عدالت میں زیر سماعت ہو اس کو عدالت ہی ختم کر سکتی ہے۔ اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ وہ اعلان کریں کہ عدالت جو فیصلہ کرے گی وہ ہم کو بلا شرط منظور ہوگا۔ اس معاملہ میں عدالت کو نظر انداز کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ ملک میں نزاع کی حوصلہ افزائی کرنے کے ہم معنی ہے۔ جو بلاشبہ تمام برائیوں میں سب سے زیادہ بڑی برائی ہے۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ڈیو کرہیسی کے نظام میں ہر فریق برابر کا حق رکھتا ہے۔ خواہ وہ اقلیت میں ہو یا اکثریت میں۔ ڈیو کرہیسی اور ڈیکلٹرشپ میں یہی فرق ہے۔ ہمارے ملک میں آزادی کے بعد ڈیو کرہیسی کا نظام قائم کیا گیا ہے۔ ایسی حالت میں کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ تفریق و امتیاز کی بات کرے۔ اس قسم کی بات کسی ایک گروہ کے خلاف نہیں ہے بلکہ وہ پورے سسٹم کو برباد کر دینے والی ہے۔ اگر سسٹم برباد ہوتا ہے تو اس کا نقصان ہر ایک کو پہنچے گا۔

سٹی چیئمن ٹی وی (مل چل) نے ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔ انہوں نے مختلف سوالات کئے۔ ایک سوال یہ تھا کہ آپ اسلامی مرکز کے صدر ہیں۔ یہ بتائیے کہ ایسا کیوں ہے کہ مسلمان موجودہ زمانہ میں اسلامی تعلیمات سے ہٹ گئے ہیں۔

میں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ بات عمومی طور پر درست نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ مسلمان اسلامی تعلیمات سے ہٹ گئے ہیں مگر اسی کے ساتھ یہ بھی درست ہے کہ بہت سے مسلمان اسلامی تعلیمات پر قائم ہیں۔ اس کی ایک مثال تبلیغی جماعت میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ علماء اور مدارس بھی اس کا ایک نمونہ ہیں۔ پھر میں نے کہا کہ عروج و زوال کے واقعات ہر قوم میں ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے اسلام میں تجدید و احیاء کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے اور خدا کے فضل سے آج بھی جاری ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو

مصلحین کو اصلاحی عمل کا ثواب کیسے ملے۔

مسجد الفاروق میں ظہر کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد حلقہٴ ارسالہ کے لوگوں نے مجھ سے کہا کہ دعوتی کام کے سلسلے میں آپ کا مشورہ کیا ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ صبر داعی کی طاقت ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ الصبر معول المؤمن (صبر مومن کا ذریعہ اعتماد ہے) میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک ایسی جامع نصیحت ہے کہ اگر اس کو کوئی پکڑ لے تو اس کو دوسری نصیحت کی ضرورت نہیں۔ صبر بلاشبہ تمام کامیابیوں کی کنجی ہے۔

محمد شہزاد علی خاں صاحب کے یہاں دوپہر کے کھانے کا انتظام تھا۔ کھانے کے بعد ایک سوال کیا گیا کہ آپ نے لوگوں کو کیا پروگرام دیا ہے۔ میں نے کہا کہ پروگرام دیا نہیں جاتا بلکہ خود بنایا جاتا ہے۔ پروگرام کا سرچشمہ دل کا ظوفان ہے۔ لفظوں میں کوئی پروگرام نہیں ہوتا۔ آپ کے دل میں اللہ کا ڈر ہونا اور دوسروں کے لئے خیر خواہی کا جذبہ ہونا، یہی پروگرام بنانا ہے۔ آپ پروگرام مانگتے نہیں بلکہ خود پروگرام ساز بنئے۔

جناب محمد راشد صاحب انصاری (۳۰ سال) نے ایک عمدہ بات کہی۔ انہوں نے کہا کہ آج کل کے لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ خبروں میں جیتے ہیں، وہ حقیقت میں نہیں جیتے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ لوگ جو کچھ اخباروں میں پڑھتے ہیں اسی سے وہ رائے بنا لیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اخباری رپورٹ میں بیک وقت دو خامیاں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ ہر اخبار انتخابی رپورٹنگ کرتا ہے۔ یعنی کچھ خبروں کو چھاپنا اور کچھ کو چھوڑ دینا۔ مزید یہ کہ اس کی یہ انتخابی رپورٹنگ اس صحافتی اصول پر مبنی ہوتی ہے کہ اچھی خبر کوئی خبر نہیں Good news is no news۔ اس صحافتی اصول کی بنا پر ہر اخبار کی رپورٹنگ نہ صرف جزئی ہوتی ہے بلکہ وہ ناقص بھی ہوتی ہے۔ یعنی وہ قوم یا فرقہ کے بارہ میں بری خبروں کو چھاپتا ہے اور اچھی خبروں کو نہیں چھاپتا۔

مزید یہ کہ اکثر اخبار خبروں کو گھٹا کر یا بڑھا کر چھاپتے ہیں۔ اس بنا پر کسی فرد یا

کسی جماعت کی تصویر جو اخبارات میں آتی ہے وہ ناقص ہوتی ہے۔

شام کو محمد شہزاد علی صاحب کے گھر پر خواتین اکٹھا ہوئیں۔ ان کو نصیحت کرتے ہوئے میں نے چند باتیں کہیں۔ ایک بات یہ تھی کہ آپ لوگ بے شکایت جینا سیکھیں۔ اس دنیا میں عورت اور مرد دونوں کو شکایتوں کے درمیان جینا پڑتا ہے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی واقعہ ایسا پیش آتا ہے جو آپ کے دل میں دوسروں کے خلاف شکایت کا جذبہ پیدا کر دے۔ یہی اس دنیا میں کسی عورت یا مرد کا سب سے بڑا امتحان ہے۔ اس دنیا میں کامیاب صرف وہ شخص ہے جو شکایتوں کے طوفان میں اپنے دل کو شکایتوں سے خالی رکھے۔ جو شکایت کے باوجود بے شکایت بن کر رہ سکے۔

بچوں کی تربیت کے سلسلے میں میں نے کہا کہ اصل تربیت یہ نہیں ہے کہ آپ ایک مقرر وقت پر جمع کر کے بچوں کو دین کے مسائل بتائیں۔ بچوں کی تربیت اس قسم کے وقتی وعظ سے نہیں ہوتی بلکہ تربیت کا اصل ذریعہ گھر کا ماحول ہے۔ اگر آپ کے گھر میں اخلاق اور انسانیت کا ماحول ہو۔ آپ کے گھر میں کسی کی نفیبت اور شکایت نہ کی جاتی ہو، اور آپ کے گھر میں دوسروں کو عزت دینے کا ماحول ہو، خواہ وہ اپنا ہو یا غیر تو یہ ماحول آپ کے گھر کو ایک زندہ تربیت گاہ بنا دے گا۔ اس کے بعد کسی رسمی وعظ کی ضرورت نہ ہوگی۔

الرسالہ ستمبر ۲۰۰۰ (دینی مدارس) پڑھنے کے بعد مولانا محمد عرفان قاسمی نے اپنا جو تاثر بیان کیا وہ انہیں کے الفاظ میں یہ تھا: میں نے الرسالہ کے اس شمارہ کو بہت غور سے پڑھا۔ سطور کو بھی پڑھا اور بین السطور کو بھی۔ سطور کے اندر آپ نے دینی مدارس کی اقدار کو انتہائی طاقتور دلائل کے ذریعہ واضح کیا ہے۔ اور بین السطور میں آپ کی ایک نئی شخصیت نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ آپ نے اپنے آپ کو قائلہ مدارس کا ایک فرد شمار کیا ہے۔ ”دینی مدارس“ کو پڑھ کر مجھے یہ احساس ہوا کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہندستان کے اندر جو لوگ دین کی خدمت کر رہے ہیں وہ اپنے اپنے دائرہ کے اندر متحرک

ہو جائیں۔ دوسرا احساس یہ ہوا کہ جو تعلیم آپ دوسروں کو ارسالہ میں دیتے ہیں خود اس کو مبالغہ کی حد تک پکڑے ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک مضمون میں آپ نے لکھا تھا کہ کسی شخص کے اندر کوئی خوبی ہو تو اس خوبی کا اعتراف کرنا چاہئے۔ کیوں کہ یہ خدا کی نعمت کا اعتراف ہے۔ دینی مدارس کے اندر میں نے دیکھا کہ آپ نے ان حضرات کی شخصیت کا کھل کر اعتراف کیا ہے جن سے آپ کو کچھ نظریاتی اختلاف تھا۔“

الرسالہ کے ایک قاری نے کچھ لوگوں کا یہ قول دہرایا کہ آپ نے ارسالہ ستمبر ۲۰۰۰ میں لکھا ہے کہ آپ نے ۱۹۶۶ میں مولانا عبد الباری ندوی سے بیعت کر لی۔ لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ بیعت کا اسلام میں حکم کیا ہے۔ آپ کی کتاب تجدید دین سے تو یہ ذہن بیٹا تھا کہ بیعت وغیرہ اسلام میں اضافہ ہے۔ لیکن دینی مدارس پڑھنے کے بعد جب آپ کا یہ اعتراف دیکھا تو لوگ متحیر ہو گئے۔

میں نے کہا کہ بیعت کے بارے میں تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں بیعت ایمان لی۔ آپ کے بعد خلفاء راشدین اور صحابہ کرام میں اس قسم کی بیعت کا کوئی ثبوت نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ کی بیعت کے معاملہ کو پیغمبر کا خصوصی معاملہ سمجھا۔ خلفاء راشدین سے جس بیعت کا ثبوت ملتا ہے وہ صرف بیعت سیاسی ہے۔ دوسرے لفظوں میں بیعت سیاسی کو دو ٹوک کہہ سکتے ہیں۔ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو گا کہ موجودہ زمانہ میں دو ٹوک کا طریقہ رائج ہونے کے بعد بیعت سیاسی کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بیعت کا موجودہ طریقہ خلافت عباسی کے زمانہ میں اسلام کے آغاز کے تقریباً دو سو سال بعد رائج ہوا۔ اس اعتبار سے بیعت کے مروجہ طریقہ کو اسلامی شریعت کا کوئی منصوص جزء نہیں کہا جاسکتا۔ اس مروجہ طریقہ بیعت کو اگر بدعت کہا جائے تو یہ ایک سخت بات ہوگی۔ کیوں کہ بہت سے صالحین امت کا نام اس میں

شامل ہے۔ اس لیے میں بطریق اہوں یہ کہتا ہوں کہ یہ ہمارے بزرگوں کی ایک اجتہادی خطا تھی۔ اور جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے، اجتہادی خطا پر بھی مومن کو ثواب ملتا ہے۔ تاہم بیعت کی ایک اور صورت ہے جس کو میں درست مانتا ہوں۔ میرے الفاظ میں یہ بیعت فطری ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔ ایک سفر کے دوران جاہلیہ کے مقام پر حضرت ابو عبیدہ خلیفہ ثانی حضرت عمر بن الخطاب کے استقبال کے لیے آئے۔ دونوں ایک دوسرے کے بہت زیادہ قدر دان تھے۔ چنانچہ دونوں نے آگے بڑھ کر یہ چاہا کہ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ کو چوم لیں۔ (البدایہ والنہایہ، الجزء السابع صفحہ ۵۵) صحابی کی طرف سے تقبیل ید کا یہ معاملہ ایک فطری معاملہ تھا نہ کہ کوئی شرعی معاملہ۔ ایسا ہی معاملہ میرے نزدیک اس چیز کا ہے جس کو میں بیعت فطری کہتا ہوں۔ یہ محبت اور اعتماد کا ایک غیر معمولی اظہار ہے۔ شرعی معنوں میں وہ نہ تو مقدس ہے اور نہ ہی اس کا یہ مطلب ہے کہ جب آپ نے ایک بزرگ سے بیعت کر لی تو وہ آپ کی دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کی ضامن بن گئی۔ خلاصہ یہ کہ میں فطری بیعت کا قائل ہوں، مگر غلو آمیز بیعت کا نہیں۔

میں نے ۱۹۶۶ میں مولانا عبد الباری ندوی سے جو بیعت کی تھی وہ اسی بیعت فطری کے معنی میں تھی۔ مولانا مرحوم کو میں نے دینی شخصیتوں میں ایک منفرد شخصیت کے طور پر دریافت کیا۔ اس دریافت کا نتیجہ علامتی طور پر بیعت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ میرٹھ کا شہر دہلی سے صرف ۷۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کو راجدھانی کا نواحی شہر کہا جاسکتا ہے۔ اس شہر کا راجدھانی کے نواح میں واقع ہونا اس کے لئے ایک قیمتی امکان ہے۔ ایسا شہر ہمیشہ بہت ترقی کرتا ہے۔ اس کی مثال دوسرے نواحی شہروں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ مثلاً غازی آباد، فرید آباد، گڑگاؤں، پانی پت، کرنال، وغیرہ۔ ان شہروں نے اپنی نواحی پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر غیر معمولی ترقی کی ہے۔ یہ

ترقی اتنی نمایاں ہے کہ ان شہروں سے گزرنے والا آدمی پہلی نظر میں اس کو محسوس کر لیتا ہے۔ میرٹھ بھی ملک کی راجدھانی کے نواح میں واقع ہے۔ مگر حیرت انگیز طور پر اس کا معاملہ مذکورہ شہروں سے مختلف ہے۔

۱۰ ستمبر کو جب کہ میں میرٹھ کی سڑکوں اور اس کے محلوں سے بار بار گزرا تو مجھے وہاں شہری چھڑے پن کے مناظر تو دکھائی دئے مگر جدید معنوں میں شہری ترقی کے مناظر میں وہاں نہ دیکھ سکا۔ اس فرق کا سبب کیا ہے۔ میرے نزدیک اس کا سبب خارج میں نہیں ہے بلکہ داخل میں ہے۔ میرٹھ کے لوگ اپنی جس تاریخ پر فخر کرتے ہیں، یہی تاریخ ان کی پسماندگی کا اصل سبب ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، ۱۸۵۷ء کی مسلح جنگ میرٹھ سے شروع ہوئی۔ یہ جنگ ناکام ہو گئی۔ مگر ہمارے مقررین اور محررین نے اس مسلح کارروائی کو اتنا زیادہ گلو ریفائی کیا کہ وہ میرٹھ والوں کے ذہن میں ایک پر فخر یاد کے طور پر باقی رہ گئی۔ حتیٰ کہ وہ ان کی قومی روایات میں شامل ہو گئی۔ وہ نسل در نسل انہی پر فخر روایات میں جیتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرٹھ عالمی ہندستان کا واحد شہر بن گیا جہاں پچھلے ڈیڑھ سو سال کے درمیان چھوٹے یا بڑے تشدد کے واقعات برابر جاری رہے۔ ”چھری اور قینچی“ میرٹھ کے کلچر کی ایک علامت بن گئی۔

یہی تشددانہ مزاج میرٹھ والوں کی پسماندگی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ اسباب کی اس دنیا میں ترقی ہمیشہ امن کی طاقت سے ہوتی ہے نہ کہ تشدد کی طاقت سے۔ میرٹھ کے لوگ اپنی روایات کے نتیجہ میں اس حقیقت سے غافل رہے۔ وہ تشدد کی بنیاد پر اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کا خواب دیکھتے رہے۔ اس قسم کا خواب حقائق کی اس دنیا میں کبھی واقعہ بننے والا نہیں، نہ میرٹھ والوں کے حق میں اور نہ غیر میرٹھ والوں کے حق میں۔ آپ کسی معلوماتی کتاب میں میرٹھ کے بارے میں پڑھیں تو اس میں آپ کو اس

قسم کے الفاظ لکھے ہوئے ملیں گے۔۔۔۔۔ ۱۸۵۷ء کی مسلح شورش سب سے پہلے میرٹھ میں شروع ہوئی:

The initial uprising of the 1857 Indian mutiny occurred there (VI, p. 753)

اب میرٹھ میں کچھ نوجوانوں کے اندر گہرا دعوتی جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ عملاً دعوتی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ ہم کو ایک باقاعدہ پروگرام دیجئے تاکہ ہم یہاں اس کے مطابق، اپنا دعوتی کام کر سکیں۔

میں نے کہا کہ دعوتی عمل ایک سیلابی عمل ہے۔ اس کا کوئی لگا بندھا پروگرام نہیں ہوتا۔ اگر آپ کو دریا کے اوپر ایک پل بنانا ہے یا ایک صنعتی کارخانہ قائم کرنا ہے تو آپ اس کا ایک لگا بندھا منصوبہ یا پروگرام بنا سکتے ہیں۔

مگر زندہ انسانوں کی دنیا میں دعوت حق کا کام اس نوعیت کا فنی کام نہیں۔ یہ ایک سیلابی نوعیت کا کام ہے۔ اس کا پیشگی طور پر کوئی متعین اور مقرر پروگرام نہیں بنایا جاسکتا۔ دعوت کے پروگرام کی اصل یہ ہے کہ آپ کے دل میں انسان کے لئے خیر خواہی کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ آپ انسان کی نجات کے لئے تڑپ اٹھیں۔ آپ کو محسوس ہونے لگے کہ اگر میں نے دوسروں کو جنت میں لے جانے کی کوشش نہیں کی تو میری اپنی جنت بھی مشتبہ ہے۔

اس قسم کا طوفانی جذبہ جب آپ کے دل میں بھڑک اٹھے تو اس کے بعد کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ دعوتی عمل کا پروگرام کیا ہے۔ اس کے بعد خود آپ کے سینہ کا طوفان آپ کو یہ بتانے کے لئے کافی ہو جائے گا کہ کب اور کس وقت آپ کو کیا کرنا چاہئے۔ میں نے کہا کہ عرب کے ایک سفر میں کچھ عرب نوجوانوں نے کہا کہ آپ نے دعوت کے موضوع کو بہت اچھی طرح کھولا ہے۔ دعوت کی اہمیت کو ہر پہلو سے واضح کیا ہے۔ مگر ابھی تک آپ نے دعوتی عمل کے لئے کوئی پروگرام نہیں دیا۔

میں نے کہا کہ قرآن دنیا کی سب سے بڑی دعوتی کتاب ہے۔ آپ سارا قرآن پڑھ جائیے مگر اس میں کہیں بھی وہ چیز نہیں ملے گی جس کو آج کل پروگرام کہا جاتا ہے۔ قرآن آدمی کے اندر دعوت کا سیلابی جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اور اس کے بعد اس کو اپنی فطرت پر اور اپنی عقل پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آدمی کے اندر واقعی معنوں میں دعوت کا جذبہ بھڑک اٹھے تو اس کے بعد اس کو کسی رسمی قسم کے پروگرام کی ضرورت نہیں۔ یہ بتاتے ہوئے میں نے عرب نوجوانوں سے کہا کہ ہمارا پروگرام، پروگرام ساز انسان بنانا ہے (ہونا مچنا ہوا اعداد المبرمجین)۔

میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں جو بتاتا ہے کہ آدمی کے اندر اگر دعوت کی تڑپ پیدا ہو جائے تو وہ کس طرح اپنے آپ میں ایک پروگرام ساز انسان بن جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ مظفر نگر (یوپی) کے ایک قصبہ کا واقعہ ہے۔ وہاں ایک مسلم خاندان کے یہاں ایک ہریجن عورت صفائی کے کام کے لئے روزانہ آتی تھی۔ گھر کی ایک بچی سے اس ہریجن عورت کی دوستی ہو گئی۔ یہ ہریجن عورت جب وہاں صفائی کے کام کے لئے آتی تو وہ سب سے پہلے مذکورہ بچی سے ملتی۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے سے بہت زیادہ مانوس ہو گئے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ گھر کے اندر جنت اور جہنم کا تذکرہ ہوا۔ لڑکی کے باپ نے کہا کہ جنت میں داخلہ کے لئے ایمان ضروری ہے۔ جو شخص مومن اور موحد ہو وہی موت کے بعد جنت میں جائے گا۔ اور جو لوگ مشرک ہیں، جو غیر اللہ کی پرستش کرتے ہیں وہ جنت میں نہیں جائیں گے۔ بچی کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ میں تو مومن اور موحد ہوں اس لئے میں تو جنت میں جاؤں گی۔ مگر ہریجن عورت تو شرک میں مبتلا ہے، وہ کس طرح جنت میں جائے گی۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ اگلے دن جب مذکورہ ہریجن عورت صفائی کے کام کے لئے

آئی تو اس نے دیکھا کہ اس کی دوست بچی گھر میں ایک کنارے کھڑی ہوئی بری طرح رو رہی ہے۔ عورت اس کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس نے پوچھا کہ تم کو کیا تکلیف ہے۔ تم کیوں اس طرح رو رہی ہو۔ بہت پوچھنے کے بعد بچی نے کہا کہ میں مومن ہوں اس لئے جنت میں جاؤں گی اور تم مشرک ہو اس لئے تم جنت میں نہیں جاؤ گی۔ اس طرح موت کے بعد کی زندگی میں میرا اور تمہارا ساتھ چھوٹ جائے گا۔ یہ سن کر ہر بچن عورت نے کہا کہ تم مت روؤ۔ میں آج سے اسلام قبول کرتی ہوں تاکہ ہم دونوں ایک ساتھ جنت میں رہیں۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اگر کسی کے دل میں دعوت کی آگ لگ جائے تو اس کے دل کی تپش خود ہی اس کو مکمل پر دگرام بتا دیتی ہے، خواہ داعی ایک عام انسان ہو، اور خواہ وہ ایک چھوٹا بچہ ہی کیوں نہ ہو۔

میرٹھ کے جلسے میں کچھ تعلیم یافتہ ہندو بھی شریک تھے۔ بعد کو ایک ہندو نے کہا کہ آپ نے اپنی تقریر میں بہت اچھی باتیں کہیں۔ مگر آپ کی ایک بات ہم کو پسند نہیں آئی۔ وہ یہ کہ آپ کی بعض باتوں سے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ آپ اسلام کو سب سے اچھا مذہب سمجھتے ہیں۔ آپ کے نزدیک اسلام دھرم سے بہتر کوئی اور دھرم نہیں۔

میں نے کہا کہ مذہب کا معاملہ ایک ذاتی عقیدہ کا معاملہ ہے۔ مذہب آدمی کو یہ یقین دیتا ہے کہ میں نے سچائی کو پایا ہے، اس سچائی کو جس کو لے کر میں اس دنیا میں جی سکوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کا یقین ہر آدمی کے لئے ضروری ہے۔ جو آدمی اس یقین سے خالی ہو وہ یا تو اعتماد کی نعمت سے محروم ہو گیا وہ حقیقی سچائی سے کم تر کسی چیز کو وہ درجہ دے دے گا جو کہ سچائی کا درجہ ہے۔

میں نے کہا کہ اگر آپ کا عقیدہ اس کے سوا کچھ اور ہو تو مجھے آپ سے کوئی نفرت نہیں ہوگی۔ میں پھر بھی انسان ہونے کے اعتبار سے آپ سے محبت کروں گا۔ البتہ جب

ایسا ہے کہ میرا یقین کسی اور سچائی پر ہو اور آپ کا یقین کسی اور چیز پر تو ایسی حالت میں میں یہ کہوں گا کہ آئیے ہم دونوں اس موضوع پر سنجیدہ اور کھلا ڈیلاگ کریں۔ تاکہ ہم حقیقی سچائی تک پہنچ سکیں۔ کیوں کہ یہ یقین جتنا ضروری ہے کہ میں نے سچائی کو پایا ہے، اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ آدمی کا یقین واقعی سچائی پر بنا ہونہ کہ کسی اور چیز پر۔ انہوں نے کہا کہ حال میں نیویارک میں مختلف مذاہب کے لوگوں کی جو میٹنگ ہوئی ہے اس میں تو یہ اعلان کیا گیا ہے:

It emphatically stated that all religions are equal.

میں نے کہا کہ اگر آپ یہ کہیں کہ تمام مذاہب یکساں طور پر قابل احترام ہیں تو میں کہوں گا کہ ہاں، عزت اور احترام کے اعتبار سے ایک مذہب اور دوسرے مذہب کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ تمام مذاہب یکساں طور پر سچے ہیں تو میں کہوں گا کہ نہیں۔ اس قسم کی بات خود مذہب کی نفی (negation) ہے۔

مذہب کیا ہے۔ مذہب سچائی کا نمائندہ ہے۔ اور سچائی اپنی حقیقت کے اعتبار سے وحدت ہے، سچائی تعدد کا تحمل نہیں کر سکتی۔ سچائی اگر متعدد ہو تو وہ سچائی ہی نہ ہوگی۔ سچائی کی اہمیت یہ ہے کہ وہ دنیا میں جینے کے لئے آدمی کا اعتقادی سہارا ہے۔ سچائی وہ ہے جو آدمی کو اس قابل بنائے کہ وہ پورے یقین کے ساتھ دنیا کے ہنگاموں میں رہ سکے۔ اس قسم کا مستحکم اعتماد صرف اس یقین کی بنیاد پر پیدا ہوتا ہے کہ میں نے جس چیز کو پایا ہے وہ کامل سچائی ہے۔ جس مذہب کی صداقت پر آدمی کو کامل یقین نہ ہو وہ ایک سیاسی مذہب یا مصلحت پرستانہ مذہب تو ہو سکتا ہے مگر حقیقی معنوں میں اس کو مذہب کی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ اس قسم کا عقیدہ صرف منافقانہ کردار پیدا کرتا ہے نہ کہ مخلصانہ کردار۔ میرٹھ میں کچھ لوگوں نے وہاں حلقہ الرسالہ کے نام سے ایک فورم بنایا ہے جس کے تحت وہ لوگ دعوتی کام کر رہے ہیں۔ اس طرح کے حلقے ملک بھر میں جگہ جگہ قائم

ہیں۔ اس معاملہ میں مجھے ناگپور کی مثال پسند آئی۔

ناگپور میں الرسالہ کے قارئین نے اسی قسم کا ایک حلقہ بنایا ہے۔ مگر اس کا نام انہوں نے حلقہ الرسالہ کے بجائے پازٹیو تھنکرس فورم (Positive Thinkers' Forum) رکھا ہے۔ یہ نام نہایت بامعنی ہے اور مجھ کو پسند ہے۔ میری خواہش ہے کہ ہر جگہ الرسالہ کے لوگ اسی نام کو استعمال کریں۔ کثرت استعمال سے انشاء اللہ پازٹیو تھنکرس فورم حلقہ الرسالہ کے لفظ کا بدل بن جائے گا۔

سوویت یونین کے ٹوٹنے سے پہلے جب اشتراکی افکار کا زور تھا تو اس زمانہ میں اس سے متاثر ادیبوں نے جگہ جگہ اپنے حلقے بنائے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو اشتراکیت پسند ادیب نہیں کہتے تھے بلکہ ترقی پسند ادیب (Progressive Writer) کہتے تھے۔ یہ لفظ زیادہ بامعنی نہ تھا۔ وہ صرف قدیم سوچ سے بغاوت کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ ایک منفی نام تھا۔ اس کے برعکس پازٹیو تھنکرس فورم پورے معنوں میں ایک مثبت نام ہے۔ وہ ایجابی فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔

محمد شہزاد علی خاں صاحب نے بتایا کہ کچھ لوگ آپ کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ آپ اکثر سیاسی معاملات میں رائے دیتے ہیں جو ٹی وی، اور اخبارات میں آتی رہتی ہے۔ یہ بزرگوں کے طریقہ کے خلاف ہے۔ اگر آپ اپنی مشن لے کر چل رہے ہیں تو آپ کو سیاسی معاملات سے الگ رہ کر خالص دین کے دائرہ میں اپنا کام کرنا چاہئے۔

میں نے کہا کہ یہ صرف غلط فہمی ہے جو ایک غلط مفروضہ پر قائم ہے۔ وہ یہ کہ عالم اور بزرگ وہ ہے جو سیاست سے دور رہے۔ میں نے کہا کہ اسلام کی تاریخ میں نہ پہلے کبھی ایسا ہوا اور نہ آج ایسا ہے۔ ماضی میں حضرت عائشہ اور حضرت حسین نے وقت کی سیاست میں حصہ لیا۔ امام ابوحنیفہ نے نفسِ ذکیہ کے سیاسی مشن میں ان کے ساتھ تعاون کیا۔ امام ابن تیمیہ اپنے زمانہ کے سیاسی حکمرانوں کے معاملات میں جرأت مندانہ طور پر اظہار خیال کرتے تھے۔

ہندستان میں شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ عبدالعزیز دہلوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد جیسے بہت سے علماء سیاسی معاملات میں اظہار خیال کرتے رہے ہیں، حتیٰ کہ ان لوگوں میں سے کئی لوگوں نے سیاسی معاملات میں عملی حصہ لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاست انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ کوئی شخص اس سے الگ نہیں رہ سکتا۔

اگر کچھ بزرگ یارین دار حضرات سیاست سے دور رہیں حتیٰ کہ وہ اخبارات بھی نہ پڑھیں تو یہ ان کا ذاتی ذوق ہے۔ ذاتی ذوق کے اعتبار سے اس میں کچھ حرج نہیں۔ لیکن وہ اگر اس ذاتی ذوق کو اسلام کا معیار قرار دیں اور سیاسی معاملات میں بے غرضانہ طور پر صالح رہنمائی دینے والوں کو بے دین سمجھیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہو گا کہ وہ یا تو جہل میں مبتلا ہیں یا انتہا پسندی کا شکار ہیں۔

مولانا محمد عرفان قاسمی نے کہا کہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنة (بخاری) اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ کلمہ گو کے لئے جنت ہے۔ اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

میں نے کہا کہ میرے مطالعہ کے مطابق، من قال لا الہ الا اللہ سے مراد من تلفظ لا الہ الا اللہ نہیں ہے۔ یعنی مجرد کلمہ کے الفاظ کی تکرار پر جنت نہیں ہے بلکہ اعتراف حق پر ہے۔ چنانچہ ایک اور روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ من عرف ان لا الہ الا اللہ دخل الجنة۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ حدیث میں ”قول“ سے مراد قول معرفت ہے۔ گویا جنت معرفت پر ہے نہ کہ مجرد قول پر۔

یہ بات قرآن سے واضح طور پر ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً سورہ المائدہ کی آیت ۸۳-۸۵ میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ ایک گروہ کو اللہ نے جنت دی اور یہ جنت ان کو ان کے قول کے بدلے میں ملی۔ (فانابہم اللہ بما قالوا جنت) مگر یہ قول کیا تھا۔ قرآن کے

مطابق، یہ ان کے داخلی عرفان حق کا ایک لسانی اظہار تھا (معا عرفوا من الحق) مزید یہ کہ ان کا یہ عرفان اتنا گہرا تھا کہ اس کے زیر اثر ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔
(اعینہم تفيض من الدمع)

ایک صاحب نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ مومن ہر حال میں جنت میں جائے گا خواہ وہ زانی ہو یا سارق ہو، کیا یہ حدیث صحیح ہے اگر صحیح ہے تو آپ اس حدیث کی تشریح کس طرح کرتے ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ مگر آپ جو اس کا مفہوم لے رہے ہیں وہ صحیح نہیں۔ اس حدیث میں دراصل اسی مسئلہ کو بتایا گیا ہے جو قرآن میں نغم کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ قرآن کی اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اہل نجات وہ ہیں جو کبار و فواحش سے اجتناب کرتے ہیں سوائے نغم کے (النجم ۳۲)

یہاں لغم سے مراد وقتی وقوع ہے۔ یعنی جذبات کے شدید غلبہ کے تحت کبھی اتفاقاً ملوث ہو جانا۔ اور پھر شدید احساس ندامت کے ساتھ اس سے تائب ہونا۔

یہی بات حدیث میں بھی آئی ہے۔ حدیث میں جو لفظ ہے وہو ان زلی و ان مسوق کا لفظ ہے، نہ کہ یزلی اور یسوق کا لفظ۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی استمراری طور پر اس قسم کا فعل کرتا رہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اتفاقی طور پر کبھی انسانی رگزوری سے مجبور ہو کر اس سے ایسا فعل سرزد ہو جائے اور پھر وہ شدت کے ساتھ اپنے گناہ کا اعتراف کرے اور یہ پختہ فیصلہ کرے کہ آئندہ وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، آیت اور حدیث دونوں میں اصلاً جس چیز کی اہمیت بتائی گئی ہے وہ سادہ طور پر وقوع گناہ نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ مومن سے اگر کبھی بشری تقاضا کے تحت کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کا حال کیا ہونا چاہئے۔ اس کے بعد اس کو گناہ کے احساس سے تڑپ اٹھنا چاہئے۔ اس کا یہ احساس اتنا شدید ہونا چاہئے کہ اس کی

آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو جائے، یہاں تک کہ فرشتے کہہ اٹھیں کہ اے رب، اپنے اس بندے کو معاف فرمادے۔ کیوں کہ اس نے اتنے آنسو بہائے ہیں جو اس کے گناہ کو دھونے کے لئے کافی ہوں۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ آخرت کے بارے میں جو نصوص (آیات و احادیث) آئی ہیں وہ بظاہر متعارض ہیں۔ اُن سے آخرت کی تصویر واضح نہیں ہوتی۔ مثلاً بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتے ہی فوراً انسان اپنے حقیقی انجام سے دوچار ہو جاتا ہے۔ اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں قیامت کے دن حساب و کتاب ہو گا۔ سوال یہ ہے کہ اگر مرتے ہی انسان جنت یا جہنم میں چلا جاتا ہے تو ان آیتوں اور روایتوں کی کیا تائیل کی جائے جن کے مطابق بظاہر تمام انسانوں کے خاتمہ کے بعد ایسا ہونے والا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ سارا اشکال اس لئے ہے کہ ہم زمان و مکان کے دنیوی تصور کے تحت آخرت کے معاملہ کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ قیاس مع الفارق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت کے بعد فوراً ہی زمان و مکان کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ماضی و حال اور مستقبل کا وہ فرق باقی نہیں رہتا جو موجودہ دنیا میں ہمیں محسوس ہوتا ہے۔

یہ اشکال اس لئے ہے کہ ہم واقعات کو فاصلوں کے اعتبار سے سمجھنے کے عادی ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا میں کچھ ایسی چیزیں رکھ دی ہیں جن کے ذریعہ ہر آدمی یہ تجربہ کرتا ہے کہ فاصلوں کا معاملہ اضافی ہے۔ مثلاً ہر آدمی کا تجربہ ہے کہ بعض اوقات ایسے خواب نظر آتے ہیں جس میں وہ ایک لمحہ میں لمبی مدت کے درمیان ہونے والے واقعات کو دیکھ لیتا ہے۔ یہی معاملہ تصور کا ہے۔ ہر آدمی کا تجربہ ہے کہ ایک لمحہ کے اندر اس کا خیال ہزاروں میل سے بھی زیادہ سفر کر سکتا ہے۔ مثلاً آپ دہلی میں بیٹھے ہوئے اپنے خیال کو ایک سکند سے بھی کم وقفہ میں نیویارک پہنچا سکتے ہیں۔ یا

آنکھ بند کرتے ہی ایک لمحہ میں سورج یا چاند کو اپنے تصور میں لا سکتے ہیں۔ یہ بات اب سائنسی مطالعہ کے ذریعہ ثابت ہو چکی ہے کہ زمان و مکاں کے تصورات اضافی ہیں۔ اس نظریہ کو سائنس میں نظریہ اضافیت (relativity) جاتا ہے۔

یہ چیزیں آخرت کے معاملہ کو ہمارے لئے قابل فہم بنا رہی ہیں۔ ان کے ذریعہ یہ امکان ثابت ہوتا ہے کہ ایک ایسی دنیا بھی ہو سکتی ہے جہاں زمانی بُعد اور مکانی فاصلے مٹ گئے ہوں۔ حال اور مستقبل کا وہ فرق باقی نہ رہا ہو جو ہم کو موجودہ محدود دنیا میں نظر آتا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے کہ آدمی جب مر کر قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو منکر نکیر اس سے تین سوال کرتے ہیں۔ من ربک، من رسولک، ما دینک۔ انہوں نے کہا کہ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ قبر کا معاملہ بہت آسان ہے۔ ان سوالات کا جواب تو ہر مسلمان دے سکتا ہے، خواہ وہ کیسا ہی مسلمان ہو۔

میں نے کہا کہ اس کا جواب قرآن میں موجود ہے اور وہ یہ کہ اس سے مراد لفظی جواب نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی جواب ہے۔ یعنی سوال کا مطلب یہ ہو گا کہ کیا تم نے اپنی زندگی میں حقیقی طور پر اللہ کو اپنا رب بنایا تھا۔ کیا تم نے حقیقی طور پر رسول کو اپنے لئے اسوہ بنایا تھا۔ کیا تم نے دین اسلام کو حقیقی طور پر اپنا دین قرار دیا تھا۔

اس تفسیر کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ منافقین رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور انہوں نے پر زور الفاظ میں کہا کہ لشہد انک لرسول اللہ۔ مگر اللہ نے ان کے اس قول کو نہیں مانا۔ اور فرمایا کہ اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین جھوٹے ہیں (المنافقون)۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقبول جواب وہ ہے جو حقیقت اور واقعیت پر مبنی ہو۔

قبر میں صرف وہ جواب کسی کے کام آئے گا جو واقعہ سچائی پر مبنی ہو گا۔ یعنی آدمی کی زندگی اسی کے مطابق گزری ہو۔ اس کے برعکس اگر اس کا جواب جھوٹ پر مبنی ہو تو

وہ ایک ایسی بات کا دعویٰ کر رہا ہے جو اس کی حقیقی زندگی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ آخرت میں بھی اس کا جواب اسی طرح رد کر دیا جائے گا جس طرح دنیا میں منافقین کے جواب کو رد کر دیا گیا (المنافقون)۔

الرسالہ کے ایک قاری نے کہا کہ میرا تجربہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا دینی شاکلہ صوفیا کے زیر اثر بنا ہے۔ چنانچہ تقریباً تمام عوام و خواص متصوفانہ شاکلہ کے تحت سوچتے ہیں۔ تبلیغی جماعت کی عوامی مقبولیت کا راز یہی ہے کہ اس نے معمولی فرق کے ساتھ اس مانوس متصوفانہ ڈھانچے کو اختیار کر لیا۔ اس کے برعکس جن جماعتوں یا تحریکوں کا ڈھانچہ متصوفانہ نہ تھا وہ عوام میں زیادہ مقبول نہ ہو سکیں۔ یہ بہت بڑا مسئلہ ہے، اس بارے میں آپ اپنی رائے بتائیں۔

میں نے کہا کہ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے آپ تعرف الاشیاء باضدادھا کے اصول کا اطلاق کریں۔ وہ یہ کہ یہ معاملہ جو آپ ہندستان میں دیکھتے ہیں وہ عرب دنیا میں سرے سے موجود نہیں۔ جب کہ عربوں کو اسلام براہ راست رسول اور اصحاب رسول کے ذریعہ ملا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کی زبان عربی ہے اور جن کو دین براہ راست رسول اور اصحاب رسول سے ملا۔ ان کا نمونہ درست نمونہ ہے یا ان لوگوں کا جن کو دین بالواسطہ ملا۔

میں صوفیا کا یا تصوف کا مخالف نہیں ہوں۔ میں خود اپنے آپ کو ایک صوفی سمجھتا ہوں۔ لیکن اسی کے ساتھ میں یہ کہتا ہوں کہ ہندستان میں جو دینی شاکلہ بنا وہ خدا پرستی سے زیادہ بزرگ پرستی سے قریب تھا۔

میرا احساس یہ ہے کہ ہندستان میں جو لوگ مسلمان ہوئے ان کی تعلیم و تربیت نہ ہونے کی وجہ سے یہاں دین کا وہ ڈھانچہ بن گیا جس کو میں بزرگ پرستی کہتا ہوں۔ ہندو قوم ایک ایسی قوم تھی جس کا پورا مذہب گرد کے تصور پر قائم تھا۔ گرد سے

گیمان لینا، گرد سے آشیر داد لینا، گرد کے واسطے سے نجات حاصل کرنا یہاں تک کہ یہ سمجھنا کہ گرد اور بھگوان میں کوئی فرق نہیں۔ اس قسم کے ذہن کے لوگ بہت بڑی تعداد میں اسلام میں اس طرح داخل ہوئے کہ اس کے بعد ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مسلمان تو ہو گئے مگر ان کے مزاج پر بدستور ہندو روایت کا غلبہ قائم رہا۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ہندستان میں بزرگ پرستی اور اکابر پرستی پر مبنی اس مذہب کی صورت اختیار کر لی جو آج مسلمانوں میں دکھائی دیتی ہے۔

اس ہندستانی اسلام کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ مومن کا جو تعلق اللہ سے ہونا چاہئے وہ تعلق مفروضہ بزرگوں سے قائم ہو جاتا ہے۔ لوگ یہ یقین کر لیتے ہیں کہ دین وہ ہے جو ان کے بزرگوں سے ملے۔ ان کو اس دنیا میں جو کچھ ملتا ہے وہ سب انہیں بزرگوں کی برکت سے ملتا ہے۔ حتیٰ کہ جنت بھی ان کو انہیں بزرگوں کے طفیل سے ملے گی۔ ان کا خیال یہ ہو جاتا ہے کہ ان بزرگوں کا چہرہ دیکھنا اور ان کے پاس بیٹھنا ان کی خدمت کرنا ان کی برکت حاصل کرنا، ان کے ملفوظات سننا، بس انہی چیزوں کا نام دین ہے۔ مگر یقینی ہے کہ یہ ایک خود ساختہ مذہب ہے۔ اس کا قرآن و حدیث والے مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔

قرآن و سنت کے مطابق، حقیقی اسلام وہ ہے جو اللہ کی معرفت پر قائم ہو۔ جس میں محبت اور خوف کے جذبات صرف ایک اللہ سے وابستہ ہو گئے ہوں۔ جو آدمی کو اللہ کی عظمت و جلال کی یاد میں جینے والا بنادے۔ جس میں انسان اللہ کی طرف بھاگے اور یہ یقین رکھے کہ جو کچھ اسے ملے گا اللہ سے ملے گا۔ کسی انسان سے اس کو کچھ بھی ملنے والا نہیں۔

جناب ڈاکٹر ذوالفقار صاحب سیفی نے کہا کہ شب برأت کے موقع پر ہمارے یہاں کچھ اشتہار لگتے ہیں۔ بعض میں شب برأت کی فضیلت کو ثابت کیا جاتا ہے اور بعض پرچوں میں اس کی تردید کی جاتی ہے۔ مسلمان کش مکش میں پڑ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بتائیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

میں نے کہا کہ یہ کش مکش کی بات نہیں ہے بلکہ دین کے معاملہ میں سنجیدہ نہ ہونے کی بات ہے۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں جو اپنے بیٹے اور بیٹی کی ترقی کے لئے ایک رات کی دھوم پر یقین کر لے یا کچھ وقتی رسوم ادا کر کے یہ سمجھے کہ اس کے تمام معاشی معاملات درست ہو جائیں گے۔ لوگ چوں کہ اپنے ذاتی معاملات میں سنجیدہ ہیں اس لئے وہ ایسے معاملہ میں، ٹوٹا اور ٹوٹکے جیسی چیزوں پر یقین نہیں کرتے مگر دینی معاملات میں وہ سنجیدہ نہیں اس لئے ان کو یہ آسان نظر آتا ہے کہ سال میں ایک رات کی دھوم مچاؤ اور جنت میں چلے جاؤ۔

مزید میں نے کہا کہ اس قسم کی دھوم والا اسلام براہ راست طور پر ہندو روایات سے اخذ کیا گیا ہے۔ ہندوؤں کے یہاں خشوع اور تقویٰ والے دین کا کوئی تصور نہیں۔ ان کے نزدیک خدا کوئی علیحدہ ہستی نہیں جس کے ساتھ اپنی توجہات کو وابستہ کیا جائے۔ وہ نمائشی رسوم، جلوس، کیرتن، نورتری اور جاگرن، جیسی دھوم والی چیزوں کو مذہب سمجھتے ہیں۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ ہندوستان کے مسلمان، ہندو مذہب کو اسلامائز نہ کر سکے۔ البتہ ہندو مذہب نے یہاں کے اسلام کو ہندوائز کر لیا۔ اسلام سے پہلے عرب کے لوگوں میں جو مذہب تھا وہ تالی بجانا اور سیٹی بجانا، اور گانے، باجے جیسی چیزوں پر مشتمل تھا۔ اسلام نے، اس نمائشی مذہب کو سنجیدہ مذہب میں تبدیل کر دیا۔ ہندوستان میں اس کے برعکس یہ ہوا کہ خدا کے دیئے ہوئے سنجیدہ مذہب کو یہاں کے لوگوں نے دوبارہ نمائش اور دھوم اور شعر خوانی کے مذہب میں تبدیل کر دیا۔

الرسالہ کے ایک قاری نے کہا کہ آپ نے جو یہ عالمی دعوتی مشن چلایا ہے اور اس میں اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ اس کے لئے لازمی تھا کہ آپ معاشی اعتبار سے فارغ ہوں۔ تو آپ نے اپنے معاشی مسائل کو کیسے حل کیا۔

میں نے کہا کہ ابتداء عمر سے ہی میرے اندر دینی خدمات کا جذبہ تھا۔ میں جب

بھی خدا سے دعا کرتا تھا تو ہمیشہ میری زبان سے یہی دعا نکلتی تھی کہ خدایا، تو مجھے اپنے دین کی خدمت کی توفیق دے۔ تاہم یہ سوال میرے ذہن میں باقی رہتا تھا کہ جب میں اپنا پورا وقت اور اپنی پوری طاقت دین کی خدمت میں لگا رہا ہوں تو میری معاشی ضروریات کیسے پوری ہوں گی۔ اس کا جواب مجھے قرآن اور حدیث میں ملا۔ قرآن و حدیث کے گہرے مطالعہ سے، میں نے سمجھا کہ دعوت کا عمل بندے کی ذمہ داری ہے۔ اور رزق کی فراہمی اللہ کی ذمہ داری۔ آخری بار جس چیز نے مجھے اس معاملہ میں یکسو کر دیا وہ ابن ماجہ اور البیہقی کی یہ روایت تھی:

من جعل الهموم همأ واحدا هم آخرته كفاه الله عن هموم الدنيا
(مشکوٰۃ المصابیح ۱/ ۸۷) جس شخص نے اپنے سارے غموں کو ایک غم بنا لیا،
آخرت کا غم، تو اللہ اس کی دنیا کے غموں کے لئے کافی ہو جائے گا۔

اللہ کی توفیق سے میں نے اس حدیث کو پورے اعتماد کے ساتھ پکڑ لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میری پوری زندگی اس حدیث کی عملی تفسیر ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہو گا کہ اللہ نے میرے ساتھ وہ معاملہ فرمایا جو قرآن میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: **ووجدك عاتلاً فاغنى** (النضحی)

میری پوری زندگی گویا **ومن يتوكل على الله فهو حسبه** کا تجربہ ہے۔ میں اکثر اپنے گھر میں اپنے بیوی بچوں سے کہتا ہوں کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ براہ راست اور بلا واسطہ اللہ کا عطیہ ہے، خواہ وہ کوئی چھوٹی چیز ہو یا کوئی بڑی چیز۔

اس تجربہ کا مجھے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ میں ہر لمحہ محسوس کرتا ہوں کہ میں اللہ کے دئے ہوئے سے پار ہا ہوں نہ کہ اپنی محنت کی کمائی سے۔

جناب محمد عارف صاحب میرٹھ (شاستری نگر) فیصل مسجد کے امام ہیں۔ میرے سفر سے پہلے میرٹھ کے ایک صاحب نے ان کو ماہنامہ الرسالہ پڑھنے کے لئے دیا۔ اس

وقت وہ رسالہ سے اس قدر بدظن تھے کہ انہوں نے اس کو واپس کر دیا اور کہا کہ مجھے رسالہ پڑھنا نہیں ہے۔ پھر میرٹھ کے لئے جب میرا پروگرام بنا تو رسالہ کے بعض قارئین نے ان کو اس کی اطلاع دی اور انہیں اجتماع میں شرکت کی دعوت دی۔ اس دعوت کو انہوں نے قبول کر لیا اور اجتماع میں آکر میری تقریر سنی اور ہماری مجلس میں بیٹھے۔ اس کے بعد ان کی طرف سے مجھے ایک خط موصول ہوا اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

ملاقات سے پہلے میں آپ کے خلاف نہایت بدظنی کا شکار تھا۔ لیکن حضرت والا کی ملاقات کے بعد فوراً ہی ذہن اور قلب متاثر ہوا اور وجہ اس کی یہ ہوئی کہ حضرت والا کی تقریر اور ملاقات کا انداز بالکل ہمارے آقا ﷺ کے طریقہ پر تھا۔ حقیقت میں اس بات کو قسم کھا کر کہا جاسکتا ہے کہ حضرت والا کا نظریہ بالکل قرآن اور حدیث کے مطابق ہے۔ کھانے پینے میں چلنے پھرنے میں اور گفتگو کرنے میں اور ملاقات کرنے میں وہ طریقہ نہیں تھا جیسا کہ آج کے علماء کے اندر بناوٹ اور اکڑنوں پائی جاتی ہے بلکہ آپ کو دیکھ کر اور ملاقات کر کے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ہمارے آقا کا طریقہ تھا۔ جو چاہتا سوال کرتا تو اس کا ضرور جواب دیا جاتا۔ اور اگر کوئی جہالت کا سوال کرتا تو اس کا بھی جواب دیا جاتا اور اگر وہ اپنی جہالت پر اڑا رہتا تو اس سے اعراض فرمایا جاتا۔ آپ کی گفتار آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قرآن و حدیث کے عین مطابق پایا جاتا ہے۔ اللہ ہمارے سر پر حضرت کا سایہ تادیر قائم رکھے، آمین۔ (محمد عارف)

میرٹھ میں ایک صاحب ہیں جن کا نام ابرار صدیقی ہے۔ کسب معاش کے اعتبار سے وہ رکشہ چلاتے ہیں۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے ساتھ رسالہ کے شمارے رکھتے ہیں اور جب بھی اور جہاں بھی وقت ملتا ہے وہ رسالہ کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں۔ ایک صاحب نے ان کا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ وہ رسالہ کے عاشق ہیں۔ رکشہ ان کے لئے کسب معاش کا ذریعہ ہے اور رسالہ ان کے لئے روحانی زندگی کا ذریعہ۔ مزید یہ کہ

وہ رکشہ کے ذریعہ نہ صرف مسافروں کو ادھر سے ادھر پہنچاتے ہیں بلکہ ان کا ”رکشہ“
 الرسالہ مشن کی اشاعت کا چلتا پھر تا ذریعہ بن گیا ہے۔ وہ لوگوں کے پاس جا کر الرسالہ
 پہنچاتے رہتے ہیں۔ میرٹھ کے بعض نوجوان جو گہرے طور پر الرسالہ سے متاثر ہیں ان کو
 سب سے پہلے الرسالہ ابرار صدیقی صاحب کے ذریعہ ہی ملا۔

میرٹھ میں کچھ نوجوان الرسالہ مشن سے اتنا زیادہ متاثر ہیں کہ انہوں نے اس کو اپنا
 مقصد حیات بنا لیا ہے۔ مثال کے طور پر محمد شہزاد علی خاں صاحب، محمد ساجد خاں صاحب،
 اور ماسٹر محمد نفیس صاحب، محمد راشد صاحب انصاری، ڈاکٹر ذوالفقار صاحب سیفی،
 وغیرہ۔ ان لوگوں کا معاملہ یہ ہے کہ ہفتہ میں چھ دن وہ اپنا کام کرتے ہیں اور ایک دن
 چھٹی کر کے الرسالہ کی اشاعت کرتے ہیں۔ وہ سائیکل اور اسکوٹر پر الرسالہ اور کتابیں
 لے کر نکلتے ہیں اور مختلف لوگوں کے یہاں جا کر ان سے ملتے ہیں۔ ان سے باتیں کرتے
 ہیں اور انہیں الرسالہ یا کتاب پڑھنے کے لئے دیتے ہیں۔ اس طرح یہ صاحبان اس اصول
 کا عملی نمونہ بن گئے ہیں جس کو الرسالہ میں ”دن میں نو مشن“ کے الفاظ میں بتایا گیا تھا۔

ان صاحبان کا طریقہ یہ ہے کہ جب وہ کسی سے ملتے ہیں تو الرسالہ کے مختلف
 شمارے اس کے سامنے اس طرح رکھ دیتے ہیں کہ وہ صفحہ اول پر چھپے ہوئے اقوال کو
 پڑھ سکے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ ان اقوال سے متاثر ہوتے ہیں اور فوراً
 الرسالہ پڑھنے کے لئے لے لیتے ہیں۔ یہ طریقہ وہ اردو اور انگریزی دونوں رسالوں کے
 لیے اختیار کئے ہیں۔

میرٹھ کے مختلف مقامات کے پروگراموں میں شرکت کے بعد شام کو منڈولی کے
 لئے روانگی ہوئی۔ جب میں گاڑی میں بیٹھ چکا تو بہت سے لوگ ہصافہ کرنے کے لئے
 آئے۔ میں نے دیکھا کہ مجھے رخصت کرتے ہوئے بعض نوجوانوں کی آنکھوں میں آنسو
 آگئے۔ انہوں نے روتے ہوئے کہا کہ مولانا صاحب، ہمارے لیے دعا کیجئے۔ میں نے ان

کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں آپ کو قبول فرمائے۔ ایک اور نوجوان نے رخصت ہوتے ہوئے کہا کہ مولانا صاحب آپ آخرت میں گواہ رہیے گا کہ ہم نے اپنی زندگی کو دعوت الی اللہ میں لگایا۔ میں نے کہا کہ یہ میری گواہی کا معاملہ نہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ دنیا میں کوئی چار انگشت جگہ ایسی نہیں، جہاں اللہ کا فرشتہ موجود نہ ہو۔ یہ فرشتے میرے جیسے انسان سے پہلے آپ کے عمل کا اندازہ اپنے دفتر میں کر چکے ہوتے ہیں۔ آخرت کے دن یقیناً وہ آپ کے حق میں اپنی گواہی دیں گے۔ میرٹھ کے اس سفر میں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں سے چند نوجوان بے حد مخلص اور دعوت کا سچا جذبہ رکھنے والے نظر آئے۔ ان کے نام یہ ہیں: محمد شہزاد علی خاں، محمد ساجد خاں، ماسٹر محمد نفیس انصاری، ڈاکٹر ذوالفقار، محمد راشد، وغیرہ۔ میرٹھ جیسے شہر میں ایسے سنجیدہ اور داعیانہ جذبہ رکھنے والے نوجوان مجھے تعجب خیز حد تک قابل قدر نظر آئے۔ اللہ تعالیٰ ان نوجوانوں کے نیک جذبات کو قبول فرمائے۔

میرٹھ کے پروگرام سے فارغ ہو کر مغرب کی نماز کے بعد وہاں سے واپسی ہوئی۔ پہلے ہم لوگ منڈولی پہنچے جو دہلی کے اطراف میں ایک گاؤں ہے۔ یہاں مولانا محمد راشد خاں قاسمی صاحب کے مدرسہ تحفیت القرآن میں کچھ دیر قیام رہا۔ یہاں کے مہتمم مولانا محمد اطہر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ میری تحریروں کو الجمعیت کے زمانہ سے پڑھتے چلے آ رہے ہیں، انہی کی گاڑی میں یہ پورا سفر ہوا۔ عشاء کی نماز اسی مدرسہ میں پڑھی گئی۔ یہاں مختلف لوگوں سے ملاقات اور گفتگو ہوئی۔ منڈولی سے واپس ہو کر ۱۰ ستمبر ۲۰۰۰ کی رات کو ہم لوگ دہلی پہنچے۔

ایک خط

برادر محترم مولانا عبدالرؤف صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۲۳ جون، ۲۰۰۱ کو دہلی میں آپ لوگوں سے ملاقات میرے لئے کافی مفید ثابت ہوئی۔ اس کے بعد میں برابر ایک سوال پر غور کرتا رہا۔ وہ یہ کہ دین اگر ایک ہے تو اس میں اتنے زیادہ اختلافات کیوں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ہمیشہ اسلام کی مختلف تعبیریں اور تفسیریں کی جاتی رہی ہیں۔ ایسی حالت میں ایک عام آدمی یہ سوچ سکتا ہے کہ جس طرح دین ایک ہے اسی طرح اس کی تشریح بھی ایک ہوتی تو عام انسان ذہنی انتشار میں مبتلا ہوئے بغیر اس واحد دین کو اختیار کر لیتا اور اس پر عمل کرتے ہوئے مر جاتا۔

اس پر غور کرنے کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ راہوں کا اختلاف کوئی برائی نہیں، بلکہ وہ ایک نعمت ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو ایک حدیث میں اس طرح بیان کی گئی ہے: اختلاف اہل رحمة۔ یعنی میری امت میں رائے کا فرق و اختلاف ایک رحمت ہے۔

دوسری بات یہ کہ اگر راہوں کا اختلاف کوئی غیر محمود چیز ہوتی تو وہ قرون مشہود لھا بالخر میں نہ پائی جاتی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ دور رسالت، دور صحابہ، دور تابعین، دور تبع تابعین، غرض پورے دور اول میں کثرت سے علماء امت کے درمیان راہوں کا اختلاف پایا جاتا رہا ہے۔ ان اختلافات کی تفصیل آپ راقم الحروف کی کتاب دین انسانیت کے باب حریت فکر (صفحہ ۶-۵۳) میں دیکھ سکتے ہیں۔

اس معاملہ کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ تخلیق آدم کے وقت فرشتوں نے خود اللہ تعالیٰ سے اختلافی نوعیت کا ایک سوال کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے کسی ناراضگی کے بغیر اس کا جواب دیا۔ یہ سوال وجواب بائبل کی کتاب پیدائش میں شاید بے ادبی سمجھ کر حذف کر دیا گیا تھا۔ مگر قرآن میں اس کو باقاعدہ طور پر درج کیا گیا۔ ملاحظہ ہو البقرہ (۳۰-۳۲) گویا اللہ تعالیٰ نے خود اپنی مثال سے یہ روایت قائم فرمائی کہ لوگوں کو حق ہے کہ وہ اختلاف کریں اور جب کوئی شخص اختلاف

رائے کا اظہار کرے تو اس کو برامانے بغیر دلیل کی زبان میں اس کی وضاحت کی جائے۔

اظہار اختلاف کو یہ درجہ دینا کوئی سادہ بات نہیں، یہ بے حد اہم بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی اختلاف کے اوپر ساری ذہنی ترقیوں کا انحصار ہے۔ جہاں اختلاف اور تنقید کا ماحول نہ ہو وہاں ذہنی ترقی کا عمل رک جائے گا۔ اس معاملہ میں ہمارے لیے جو انتخاب (choice) ہے وہ تنقید اور بے تنقید میں نہیں ہے، بلکہ تنقید اور ذہنی جمود میں ہے۔ یعنی جہاں تنقید کا ماحول نہ ہو وہاں جو چیز پائی جائے گی وہ ذہنی جمود ہو گا نہ کہ سادہ طور پر محض بے تنقید حالت۔

حقیقت یہ ہے کہ تنقید اور اختلاف کا معاملہ اللہ کی اس سنت سے جڑا ہوا ہے جس کو فطرت کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس فطرت کے تحت انسان کو پیدا کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے انسان کو ایک عظیم نعمت دی جس کو دماغ (brain) کہا جاتا ہے۔ یہ دماغ لامحدود فکری استعداد کا حامل ہے۔ مگر اس دماغ کا بڑا حصہ خوابیدہ حالت میں رہتا ہے۔ اس کو جگانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ فکری چیلنج ہے۔ جب انسان کے دماغ میں افکار کا نگر او پیش آتا ہے تو اس وقت اس کی سوئی ہوئی فکری صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ آدمی اپنے ان دماغی امکانات کو استعمال کرنے کے قابل ہو جاتا ہے جن کو وہ ابھی تک استعمال نہ کر سکتا تھا۔

بچوں کی تعلیم کا ایک طریقہ وہ ہے جس کو اکتشافی طریقہ (discovery method) کہا جاتا ہے۔ مثلاً اونٹ کے جسم کے مختلف اعضاء کو لکڑی کے الگ الگ ٹکڑوں میں تراشا، اور پھر ان مختلف اور بے ترتیب ٹکڑوں کو بچہ کو دے کر یہ کہنا کہ ان کو جوڑ کر اونٹ بناؤ۔ بچہ جب اس طرح مختلف ٹکڑوں کے ذریعہ خود ایک اونٹ بناتا ہے تو وہ عام طریقہ سے زیادہ اس کو ذہن نشین کر لیتا ہے۔

یہی معاملہ حق کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں حق کو دو اور دو بل کر چار جیسے حسابی فارمولے کی صورت میں نہیں رکھا، بلکہ اس میں فرق و اختلاف کی گنجائش رکھ دی، حتیٰ کہ قرآن کے مطابق، اس پر التباس (لا اتمام ۹) کا پردہ ڈال دیا۔ یعنی ہر چیز میں ایک شبہ کا عنصر (element of doubt) رکھ دیا۔ یہ اللہ کا تخلیقی نقشہ ہے، اور وہ اس لیے ہے تاکہ ہر انسان اپنی

قوت فکر یہ کو استعمال کر کے سچائی کو دریافت کرے۔ سچائی ہر آدمی کے لیے ایک ذاتی معرفت (finding) ہونہ کہ محض نسلی یا رسمی عقیدہ۔

آپ جانتے ہیں کہ قرآن میں تفکر اور تدبیر پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اگر دین کا معاملہ ”دو اور دو مل کر چار“ جیسا ایک سادہ معاملہ ہو تو تفکر اور تدبیر کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ دین کے ساتھ غور و فکر جڑا ہوا ہے اور غور و فکر کا عمل اختلاف اور تنقید کے بغیر نتیجہ خیز طور پر ممکن ہی نہیں۔

میں قرآن و حدیث پر غور کرنے کے بعد یہ سمجھا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی جنت میں بسانے کے لیے نہایت اعلیٰ قسم کے انسان درکار ہیں۔ یہ وہ انسان ہیں جنہوں نے اللہ کو ایک شعوری حقیقت کے طور پر دریافت کیا۔ جنہوں نے غیب میں اللہ کا مشاہدہ کیا۔ جنہوں نے فطرت کے حسن میں جنت کی جھلکیاں دیکھیں۔ جن کو اس دنیا میں ایسے روحانی تجربے ہوئے جو ان کے سینے میں اللہ کی یاد کے چشمے جاری کر دیں۔ مومن وہ ہے جس پر اسی دنیا میں مشاہدہ حق کی وہ حالت گزر جائے جو غیر مومن پر آخرت میں براہ راست مشاہدہ کے بعد گزرے گی۔

یہ گویا پیدا انشی انسان کے اندر ایک نئے انسان کا بننا ہے۔ یہ ایک قسم کا روحانی تحول و تغیر (spiritual transformation) ہے۔ اور یہ روحانی تحول یا روحانی تغیر ہمیشہ تفکیری عمل (thinking process) کے ذریعہ ہوتا ہے نہ کہ خوش عقیدگی یا پراسرار برکت کے ذریعہ۔

الترمذی کی ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: **الا ان سلعة الله غالية، الا ان سلعة الله الجنة** (مشاکاة المصابیح ۱۳۶۹/۳) یعنی سن لو کہ اللہ کا سودا بہت مہنگا ہے اور اللہ کا سودا جنت ہے۔ یہ بات قرآن اور حدیث میں مختلف انداز سے بار بار آئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت ایک بے حد قیمتی سودا (commodity) ہے۔ اور وہ اس کی مہنگی قیمت دے کر ہی کسی کو ملے گی۔ جنت کسی کو اس طرح نہیں مل سکتی کہ کسی شیخ کی زیارت کر لی جائے یا صاحب برکت سے برکت حاصل کر لی جائے یا کوئی بڑا اسرار کلمہ اپنی زبان سے دہرایا جائے یا کسی بزرگ کی نسبت اور وسیلہ حاصل کر لیا جائے۔ جنت کی قیمت خوش عقیدگی نہیں ہے بلکہ جنت کی قیمت

زندہ شعور ہے۔ جنت کا تعلق ہر اسرار فضائل سے نہیں ہے بلکہ ایک معلوم روحانی اور شعوری انقلاب سے ہے۔ جنت کا ٹکٹ کسی کو اس کی حقیقی قیمت کی ادائیگی پر ملے گا۔ قرآن کے الفاظ میں، امانی کی بنیاد پر کسی کو جنت ملنے والی نہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان طرح طرح کی خوش فہمیوں میں مبتلا ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ صحیح تلفظ کے ساتھ کلمہ پڑھ لو تو جنت ہے، کسی بزرگ سے بیعت کر لو تو جنت ہے، صلاۃ ا تسبیح پڑھ لو تو جنت ہے، قرآن کا حافظہ کر لو تو جنت ہے، چلہ میں چلے جاؤ تو جنت ہے، اکابر کی دعائیں لے لو تو جنت ہے، کسی برکت والے کا دیدار کر لو تو جنت ہے، نعت خوانی اور میلاد خوانی کر لو تو جنت ہے، کسی مسلم خاندان میں پیدا ہو جاؤ تو جنت ہے، وغیرہ۔

یہ تمام باتیں وہی ہیں جن کو قرآن میں امانی (النساء ۱۲۳) کہا گیا ہے۔ یعنی آرزوئیں اور خوش خیالیاں (wishes)۔ اس آیت کی تفسیر میں مولانا محمود حسن صاحب نے جو نوٹ لکھا ہے وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

”کتاب والوں یعنی یہودیوں اور نصرانیوں کو خیال تھا کہ ہم خاص بندے ہیں۔ جن گناہوں پر خلقت پکڑی جائے گی ہم نہ پکڑے جائیں گے۔ ہمارے پیغمبر حمایت کر کے ہم کو بچالیں گے۔ اور نادان اہل اسلام بھی اپنے حق میں یہی خیال کر لیا کرتے ہیں۔ سو فرمایا کہ نجات اور ثواب کسی کی امید اور خیال پر موقوف اور منحصر نہیں۔ جو برا کرے گا پکڑا جائے گا۔ کوئی ہو اللہ کے عذاب کے وقت کسی کی حمایت کام نہیں آسکتی۔ اللہ جس کو پکڑے وہی چھوڑے تو چھوٹے۔ اور جو کوئی عمل نیک کرے گا بشرطیکہ ایمان بھی رکھتا ہو سو ایسے لوگ جنت میں جائیں گے اور اپنی نیکیوں کا پورا ثواب پائیں گے۔ خلاصہ یہ کہ ثواب و عقاب کا تعلق اعمال سے ہے۔ کسی کی امید اور آرزو سے کچھ نہیں ہوتا۔ سو ان امیدوں پر لات مارو اور نیک کاموں میں ہمت کرو۔“ (صفحہ ۱۲۶)

ایک اہم اطلاع

ہم یہ اطلاع دیتے ہوئے از حد خوشی محسوس کر رہے ہیں کہ 'الرسالہ ہندی' جس کی اشاعت کافی عرصہ سے رک گئی تھی، اب انشاء اللہ جنوری ۲۰۰۲ سے ممبئی سے مستقل شائع ہوگا۔

خریدار حضرات سے گزارش ہے کہ 'الرسالہ ہندی' کا سالانہ زر تعاون بذریعہ M.O./DD/Cheque 'الرسالہ' کے نام (غیر مقامی چیک کے لئے 50

روپے مزید) مندرجہ ذیل پتہ پر روانہ فرمائیں:

زر تعاون فی کاپی: -/10 روپے

سالانہ زر تعاون -/110 روپے

خط و کتابت کے لئے رابطہ قائم کریں:

ایجنٹ حضرات بھی اسی پتہ پر رابطہ قائم کریں:

Address:

Manager Al-Risala,
E-4, Marian House,
29th, Road, T.P.S. III
Opp. Waterfield Road,
Bandra (W), Mumbai- 400 050

Tel. No:

6429428

Fax No:

6516171

Books By Maulana Wahiduddin Khan

- | | |
|--|--|
| Islam Rediscovered | The Teachings of Islam |
| A Treasury of the Quran | The Good Life |
| The Quran for All
Humanity | The Garden of Paradise |
| The Quran: An Abiding
Wonder | The Fire of Hell |
| The Call of the Qur'an | Islam and the Modern
Man |
| Muhammad: A Prophet
for All Humanity | Uniform Civil Code |
| Words of the Prophet
Muhammad | Man Know Thyself |
| An Islamic Treasury of
Virtues | Muhammad: The Ideal
Character |
| Islam and Peace | Polygamy and Islam |
| Introducing Islam | Hijab in Islam |
| The Moral Vision | Concerning Divorce |
| Principles of Islam | Search for Truth |
| Indian Muslims | The Concept of God |
| God Arises | The Creation Plan of God |
| Islam: The Voice of
Human Nature | The Man Islam Builds |
| Islam: Creator of the
Modern Age | Non-Violence and Islam |
| Woman Between Islam
and Western Society | Islamic Fundamentalism |
| Woman in Islamic
Shari'ah | The Shariah and Its
Application |
| Islam As It Is | Spirituality in Islam |
| Religion and Science | Islamic Activism |
| Tabligh Movement | Islam Stands the Test of
History |
| The Way to Find God | The Revolutionary Role
of Islam |
| | Islam in History |
| | Conversion: An
Intellectual
Transformation |

Goodword Books

- Tell Me About the Prophet Muhammad (HB)
- Tell Me About the Prophet Muhammad (PB)
- Tell Me About the Prophet Musa (HB)
- Tell Me About Hajj (HB)
- Tell Me About Hajj (PB)
- Honeybees that Build Perfect Combs
- The World of Our Little Friends, the Ants
- Life Begins (PB)
- The First Man (HB)
- The First Man (PB)
- The Two Brothers (HB)
- The Two Brothers (PB)
- The Ark of Nuh (HB)
- The Ark of Nuh (PB)
- The Brave Boy (PB)
- Allah's Best Friend (PB)
- The Travels of the Prophet Ibrahim
- The Origin of Life (Colouring Book)
- The First Man on the Earth (Colouring Book)
- The Two Sons of Adam (Colouring Book)
- The Ark of Nuh and the Animals (Colouring Book)
- The Brave Boy (Colouring Book)
- Allah's Best Friend (Colouring Book)
- The Travels of the Prophet Ibrahim (Colouring Book)
- The Ark of Nuh and the Great Flood (Sticker Book)
- The Story of the Prophet Nuh (HB)
- The Story of the Prophet Nuh (PB)
- The Blessings of Ramadan (PB)
- The Story of Prophet Yusuf
- Stories from the Quran
- The Holy Mosques
- The Holy Quran (PB)
- The Holy Quran (Laminated Board)
- The Holy Quran (HB)
- A Dictionary of Muslim Names
- The Most Beautiful Names of Allah (HB)
- The Most Beautiful Names of Allah (PB)
- The Pilgrimage to Makkah
- One Religion
- Islamic Economics
- The Story of Islamic Spain (PB)
- The Travels of Ibn Battuta
- Humayun Nama
- Islamic Sciences
- Islamic Thought...
- The Qur'an for Astronomy
- Arabic-English Dictionary for Advanced Learners
- The Spread of Islam in the World
- A Handbook of Muslim Belief
- The Muslims in Spain
- The Moriscos of Spain
- Spanish Islam (A History of the Muslims in Spain)
- A Simple Guide to Muslim Prayer
- A Simple Guide to Islam
- A Simple Guide to Islam's Contribution to Science
- The Quran, Bible and Science
- Islamic Medicine
- Islam and the Divine Comedy
- The Travels of Ibn Jubayr
- The Arabs in History
- Decisive Moments in the History of Islam
- My Discovery of Islam
- Islam At the Crossroads
- The Spread of Islam in France
- The Islamic Art and Architecture
- The Islamic Art of Persia
- The Hadith for Beginners
- How Greek Science Passed to Arabs
- Islamic Thought and its Place in History
- Muhammad: The Hero As Prophet
- A History of Arabian Music
- A History of Arabic Literature
- The Quran
- Selections from the Noble Reading
- The Koran
- Allah is Known Through Reason
- The Miracle in the Ant
- The Miracle in the Immune System
- The Miracle of Creation in Plants
- The Miracle in the Spider
- Eternity Has Already Begun
- Timelessness and the Reality of Fate
- Ever Thought About the Truth?
- Crude Understanding of Disbelief
- Quick Grasp of Faith
- Death Resurrection Hell
- The Basic Concepts in the Quran
- The Moral Values of the Quran
- Heart of the Koran
- Muhammad: A Mercy to All the Nations
- The Sayings of Muhammad
- The Beautiful Commands of Allah
- The Beautiful Promises of Allah
- The Muslim Prayer Encyclopaedia
- After Death, Life!
- Living Islam: Treading the Path of Ideal
- A Basic Dictionary of Islam
- The Muslim Marriage Guide
- GCSE Islam—The Do-It-Yourself Guide
- The Soul of the Quran
- Presenting the Quran
- The Wonderful Universe of Allah
- The Life of the Prophet Muhammad
- History of the Prophet Muhammad
- A-Z Steps to Leadership
- The Essential Arabic
- A Case of Discovery

HNI NO. 28622/76 • U(SE) 12/2001
Delhi Postal Regd. No. DL/1154/2001

Goodword
B · O · O · K · S

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013
Tel. 435 5454, 435 6666, 435 1128, Fax: 435 7333, 435 7980
e-mail: info@goodwordbooks.com